
خاک دان
ناول
نادیہ عنبر لودھی

خاک دان

رو میں ہے رخشِ عمر

نام: نادیہ عنبر لودھی

خاندانی نام: نادیہ لودھی

تخلص: عنبر

والد: فاروق خان لودھی

والدہ: شمیم لودھی

بہن بھائی: ایک بہن دو بھائی

اولاد: الوینہ، حارث، ہادی، ولی

تاریخ پیدائش: ۲۳ جولائی، ۱۹۸۰، اسلام آباد، پاکستان

تعلیم: میٹرک فضائیہ اسکول کورنگی کریک کراچی

ایم اے اردو: پنجاب یونی ورسٹی لاہور

رشتہ ازدواج: سات نومبر، ۱۹۹۹

ملازمت: خبریں مانچسٹر یوکے ۲۰۱۶ تاحال

تصنیفات

شب غم کا جوش (کالمز)

تعاقب میں خواب (شاعری)

,معاصر اردو شاعرات حصہ اول

گمراہ اور دوسری کہانیاں (کہانیاں)

اردو کی خواتین ناول نگار

دہلی اور آگرہ کے لودھی

سلاطین کی تاریخ

زیر طبع کتب

معاصر اردو شاعرات حصہ دوم

اے حقیقت منتظر (تصوف)

رہائش: راولپنڈی، پاکستان

خاک دان

(اردو ناول)

نادیہ عنبر لودھی

عنکبوت ای پبلشرز اسلام آباد

نام کتاب: خاک دان
مصنفہ: نادیہ عنبر لودھی
موضوع: ناول
تزئین و آرائش: عنکبوت علی
کتابت: ابن مختار
برقی اشاعت: جولائی ۲۰۲۶
ناشر: عنکبوت ای پبلشرز اسلام آباد

انتساب

ولی

اور

ہادی

کے نام

فہرست

اس ناول کے تمام واقعات اور کردار فرضی ہیں۔ کسی سے ان کی مطابقت محض اتفاقیہ ہو گی۔

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفَس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
اقبال

"It might be lonelier without the loneliness."

Emily Dickinson

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

غالب

دل بھی پایا تو بلا کا زود رنج
اک اداسی گھیرے رہتی ہے اسے

نادیہ عنبر لودھی

“Write what should not be forgotten”

Isabel Allende

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

جون ایلیا

تخلیق کا شعلہ

نادیہ عنبر لودھی کا ناول خاکدان دردسے جڑا ہوا ہے۔ شاعری، کالم نگاری، کہانی اور اب ناول۔۔۔ تخلیق کا بھڑکتا ہوا شعلہ آگے کیا رنگ اختیار کرے گا۔ یقیناً الاؤ بن کر جہان کو منور کرے گا۔ خاکدان ناول کا انداز داستان کا ہے۔ نادیہ عنبر لودھی کے ناول کی کہانی بہاؤ کے ساتھ چلتی ہے۔ ناول کا مربوط پلاٹ اور جاندار کردار قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں ناول کی کہانی وقت کے سمندر پر سفر کرتی ہے۔

کبھی چھوڑی ہُوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

کھٹک سی ہے جو سینے میں، غمِ منزل نہ بن جائے

اقبال

نادیہ کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں کے ساتھ جذب ہو کر چلتے ہیں۔ لیکن کہیں تانیثی ڈسکورس کی مثال بھی بن جاتے ہیں۔ مزاحمتی لحن تو اختیار نہیں کرتے مگر سوچنے والی مخلوق ہیں۔ اردو میں پنجابی کی آمیزش اس ناول کا رشتہ دھرتی سے جوڑتی ہے۔ تو دھرتی دھرتی ماں بن جاتی ہے۔ ناول کی جڑیں اسی دھرتی ماں میں پیوست ہیں دیس پردیس اور دشمن دیس کی فضائیں مل کر ناول کے ڈکشن کو طاقتور بناتی ہیں۔

نادیہ عنبر لودھی صاحبہ تقریباً دس سال سے ہمارے ادارے سے منسلک ہیں اور گاہے بگاہے ان کی شاعری وتحریر ہمارے اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ ہمارے قارئین ان کے کلام اور تحریروں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ مجلس ادارت نادیہ عنبر لودھی کو مبارکباد پیش کرتی ہے میرا ادارہ محترمہ کے ادبی کارناموں پر فخر کرتا ہے۔ انکی اونچی اڑان کے دعاگو ہے۔

محمد جاوید خان

بانی وچیف ایڈیٹر

خبریں مانچسٹر یوکے

+447775767018

زندگی درد کا صحیفہ ہے

یہ ناول خاکدان داستان خونچکاں ہے ۔اسے چشمِ تر سے لکھا گیا ہے۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے پچھتاوے کے ناگ، نوحہ خوانی کرتے ہوئے دل، تہذیب کی تباہی کے ماتم کرتے ہوئے وجود اس زمین سے مٹتے جارہے ہیں۔ نئی نسل کی اپنی ترجیحات ہیں۔ دنیا اپنے پر سمیٹ رہی ہے۔ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ معلومات کا ایک سیلاب ہے_ جو اے آئی کی شکل میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا رہا ہے۔ کتاب کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارے ملک پاکستان کی طرح ہماری زبان اردو، ہمارا ماضی، جدوجہد آزادی اور اسلاف کے قصے قصہ پارینہ بنتے جارہے ہیں۔ زبان کا ذائقہ، پیسے کا حصول اور رنگین سکرین کا جلوہ ہمیں مہندم کر رہا ہے۔ لیکن سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو ادب کی ترویج کے لیے بھی استعمال کیا جارہا ہے جو کہ خوش آئندہ بات ہے میں نے بھی یوٹیوب چینل کے ذریعے ادب کی ترویج کی کوشش کی ہے۔ اردو ادب کے بنیادی مباحث کو سلیس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ادق تنقیدی نظریات کو عام فہم اسلوب میں ڈھالا ہے۔

اس ناول کو لکھنے کا نہ تو ارادہ تھا نہ کوئی خیال_ بس لکھنا شروع کیا تو ناول بن گیا۔۲۰۱۶ سے شروع ہونے والا نثر کا سفر چھ کتابوں کی شکل میں اردو ادب کے پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔ مجموعہ کالمز شبِ غم کا جوش، کہانیوں کی کتاب گمراہ ،شاعری کا مجموعہ تعاقب میں خواب، تحقیقی نوعیت کی دو کتابیں معاصر اردو شاعرات اور اردو کی خواتین ناول نگار، ترجمہ دہلی اور آگرہ کے لودھی سلاطین کی تاریخ چھپ چکے ہیں۔ اب یہ ناول خاک دان آپ کے سامنے ہے۔ دس برس کا یہ سفر محنت، ہمت اور رب دو جہاں کے فضل و کرم سے طے ہوا۔ ملکی اور غیر ملکی جرائد بشمول بیاض، ادب لطیف، چہار سو، سائبان، دیدبان، انشاء تسطیر، نیرنگ خیال میں میری تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ماہانہ رسائل (ڈائجسٹوں) میں کہانیاں لکھتی ہوں۔

جہاں تک ناول خاکدان کا تعلق ہے یہ ان افراد کی داستان ہے جن کے گلی کوچے ان کے لیے اجنبی بن گئے۔ شاید آج کے نوجوان ان کے درد کو نہیں سمجھ سکتے۔

زندہ رہتے ہیں کیا یہ کافی نہیں
کوئی لازم ہے کہ خوش بھی ہو

ہم آخری نسل ہیں۔ نوحہ خوانوں کی۔ ہمارے بعد آنے والوں سے ہمیں امید رکھنی چاہیے مگر کیا کیجئے۔ حقائق تلخ ہیں۔

ہجرت

تم ہجرت کا کرب نہیں جانتے
تم نے "انتظار حسین" کے افسانے نہیں پڑھے
"ناصر کاظمی" کے اشعار میں چھپے ہوئے نوحے نہیں سنے
جو پاکستان کو بنتے دیکھا ہوتا
گھروں کو جلتے دیکھا ہوتا
عصمتیں لٹتی
گردنیں کٹتی دیکھی ہوتی
زندگی بکھرتی دیکھی ہوتی
تو شاید تم ہجرت کا کرب جان لیتے
فاسٹ فوڈ کے شوقین
اپنے حال میں گُم
تمہارا کوئی مذہب کوئی نظریہ نہیں ہے
پیٹ کی بھوک سے جنسی آسودگی تک مطمئن
حیوانی جبلت و فطرت
اس ہجرت کے درد کو کیسے محسوس کر سکتی ہے

(نادیہ عنبر لودھی)

نئی نسل جو شارٹ کٹ کی عادی ہے وہ نہیں جانتی کہ مسلسل جدوجہد سے نسلیں ترقی کرتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے شروع ہونے والی یہ کہانی تین نسلوں تک پھیل گئی۔ کیسے عام افراد بڑے عہدوں پر جا پہنچے؟ جاننے کے لیے اس ناول کو پڑھیئے۔

سوشل میڈیا کے اس دور میں جدوجہد پاکستان کہیں پس منظر میں چلی گئی ہے۔ اس ناول کو لکھنے کا یہ ہی مقصد ہے ہمارے اجداد نے آگ اور خون کے دریا کو عبور کر کے پاکستان بنایا تھا۔ اس پاکستان کی قدر کیجئے۔

نادیہ عنبر لودھی

ریذیڈنٹ ایڈیٹر خبریں مانچسٹر یو کے

اسلام آباد

پاکستان

nadiaumberkhanlodhi@gmail.com

پہلا باب:

برما محاذ

فروری ۱۹۴۲ جنگ عظیم دوئم

فضا میں خون ، جلے ہوئے گوشت اور بارود کی ناگوار مہک پھیلی ہوئی تھی ۔ جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ زخمی سپاہی کراہ رہے تھے ۔ تڑپ رہے تھے ۔ کچھ تو نیم بے ہوش تھے اور کچھ جن میں توانائی باقی تھی۔ وہ خود کو گھسیٹ کر اس منظر نامے سے دور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ۔

بھوک اور پیاس کی شدت نے اکثریت کو نڈھال کرر کھا تھا۔ کسی کے چہرے پر موت کی نیلاہٹ تھی اور کسی کا چہرہ ترو تازہ تھا- تو کسی کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اور کسی کی بالکل بند تھیں ۔ ان سپاہیوں کی وردیوں کی جیبوں میں میں نئی گولیاں تھیں -جو کہ وہ چلا نہیں سکے تھے ۔

یہ گولیاں ریوالور اور رائفل کی تھی ۔ خاک پر بکھرے یہ بے روح وجود جلد خاک میں ملنے والے تھے۔ ان کی لاشیں چیلیں، کوے، گدھ اور جنگلی جانور کھا جائیں گے_ کہیں بہت دور ہندوستان میں انکے پیارے ان کے منتظر تھے ۔ جن سے محبت بھرے وعدے کیے تھے ۔ جن کے ہاتھوں کو چوما تھا۔ جن کو سینے سے لگایا تھا۔ اپنا بنایا تھا۔ انکی آنکھیں راہ تک رہی تھیں ۔ ہر سانس کے ساتھ دعا کر رہی تھیں ۔ کہ ان کے پیارے صحیح سالم واپس لوٹ آئیں ۔ لیکن دعائیں ہمیشہ قبول ہو جائیں یہ لازمی تو نہیں ہے ۔

پہلی جنگ عظیم میں ۱۳ لاکھ ہندوستانی سپاہیوں نے سلطنتِ برطانیہ کیلیئے اپنی خدمات پیش کیں جن میں سے ۴ لاکھ مسلمان تھے اور باقی ہندو اور سکھ تھے ۔ وہ سلطنتِ برطانیہ جس کی ملکہ کے لباس میں سجے ہوئے سب ہیرے مختلف نو آبادیات سے لوٹے گئے تھے ۔ اس لباس کو ملکہ وکٹوریہ بہت شان سے زیب تن کرتی تھی ۔ ملکہ وکٹوریہ کے ایک اشارے پر ملکوں کی تقدیر کے فیصلے ہوا کرتے تھے ۔ ملکہ جس کے نو بچے تھے لیکن اس کے باوجود وہ تنہا تھی اور اپنے معاشقوں کے لیے مشہور تھی ۔ ملکہ کا آخری اسکینڈل بھی ایک ہندوستانی منشی عبدالکریم کے ساتھ مشہور ہوا تھا۔ منشی عبد الکریم نامی ایک ہندوستانی جس کا تعلق ہندوستان کے شہر آگرہ سے تھا۔ اس کو ۱۸۸۷ میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کے پچاس سال مکمل ہونے پر گولڈن جوبلی کی تقریبات میں شرکت کے لیے برطانیہ بھیجا گیا تھا۔ اس منشی کے بھیجنے کا مقصد دوران تقریب ملکہ کو ایک مہر پیش کرنا تھی ۔ اس کے ساتھ

ایک ہندو نوجوان بھی منتخب کیا گیا تھا۔ یہ دونوں بحری جہاز کے ذریعے برطانیہ پہنچے انہیں آداب محل سکھائے گئے اور انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کو مہر پیش کی۔ ہندو نوجوان جشن کے بعد واپس چلا گیا جب کہ عبد الکریم کو ملکہ نے اپنا منظور نظر بنالیا۔ منشی عبد الکریم تیرہ برس ملکہ وکٹوریہ کے محل ونڈسر محل میں ملکہ کے ساتھ رہا۔ ملکہ اس منشی پر بہت مہربان تھی۔ وہ عبد الکریم کو ہر لمحہ ساتھ رکھتی تھی۔ ملکہ اس سے اردو زبان سیکھتی تھی اور وہ ملکہ کو ہندوستانی کھانے پکا کر کھلاتا۔ منشی عبد الکریم کو خوش کرنے کے لیے ملکہ روزنامچہ اردو زبان میں لکھتی تھی۔ ملکہ نے عبد الکریم کو ہندوستان میں تین سو ایکڑ زمین بھی دی تھی۔ ملکہ کے بچوں کو منشی پر ملکہ کی عنایات سخت ناپسند تھی۔ ملکہ منشی کو ہر وقت دم چھلا بنائے رکھتی تھی۔ ملکہ کے بچے اس کو شاہی آداب کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن ملکہ منشی کریم کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتی تھی۔ ۱۹۰۱ میں ملکہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شاہ ایڈورڈ ہفتم نے منشی عبد الکریم کو برطرف کر کے آگرہ واپس بھیج دیا۔ اس نے منشی کو ملکہ کا آخری دیدار نہیں کرنے دیا۔ برطانیہ کے نئے بادشاہ نے منشی کو ملکہ کی آخری رسومات میں شرکت سے بھی روک دیا جو خط ملکہ نے ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں منشی کو لکھے تھے۔ وہ ضبط کر لیے گئے۔ کاش کہ ملکہ ہندوستان پر بھی اتنی ہی مہربان ہوتی تو ہندوستانیوں کے بے گناہ خون سے ہندوستان کی زمین رنگین نہ ہوتی۔

*****

جالندھر، پنجاب، ہندوستان ۱۹۴۲

جنوری کا مہینہ تھا۔ سردی ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ دھوپ بھی کم کم نکلتی تھی۔ کمرے کو گرم رکھنے کے لیے محمد بی بی نے اپلوں کی آگ جلائی رکھی تھی۔ فرش پر مختاراں دائی گرم پانی، دیسی گھی اور پرانے کپڑوں کا ڈھیر لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے حسنہ ٹانگیں پھیلائے لیٹی تڑپ رہی تھی۔ اسے کسی کروٹ بھی قرار نہیں مل رہا تھا۔ دردوں کی لہریں اس کی جان نکال رہی تھی۔ فطرت نے درد کے لیے عورت کو چنا ہے اور مزے کے لیے مرد کو۔ حسنہ کے سر کی طرف اس کی ماں ام کلثوم حسنہ کا سر گود میں لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ ''بس دھیے بس تھوڑا حوالہ - رب سوہنا آسانی کرے گا''

بیٹی کو دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

حسنہ کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ نڈھال تڑپ رہی تھی۔ اس کی ساس محمد بی بی اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بچے کی پوزیشن کا اندازہ لگا رہی تھی۔ کمرے میں دو لالٹینیں چل رہی تھی۔ حسنہ دردِ زہ سہہ رہی تھی۔ عورتیں اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ حسنہ تڑپ رہی تھی۔ پہلا بچہ تھا۔ یہ تکلیف اس پر پہلی دفعہ آئی تھی۔ دردیں لے لے کر اس کا برا حال ہو چکا تھا۔ بچہ مسلسل گھوم رہا تھا اور حسنہ کو بھی گھما رہا تھا۔ بچہ الٹا تھا۔ دائی ہاتھوں کو دیسی گھی لگا کر بچے کو سیدھا کرنے کی کوشیش کر رہی تھی۔

جونہی بچے کا سر نیچے کی طرف آیا۔ دائی نے زور لگاؤ کا شور مچایا۔

"دھیے زور لا (لگا)۔ دھیے زور لا (لگا)"

"تھوڑا جیا ہور" (تھوڑا سا اور)

محمد بی بی نے حسنہ کا پیٹ دبانا شروع کیا۔ آخر بچہ باہر آ گیا۔ حسنہ کو ہلکے پن کا احساس ہوا اور وہ غنودگی میں چلی گئی۔ فجر کی اذان کے ساتھ بچہ پیدا ہو گیا۔

مبارک ہو_ بیٹا ہوا ہے_" دائی بولی_"

دائی نے بچہ صاف کر کے کپڑے میں لپیٹا اور ام کلثوم کو پکڑا دیا۔ دونوں سمدھنوں نے ایک دوسرے کو مبارک دی۔

حسنہ کو بھی اتنے میں ہوش آ گیا۔ محمد بی بی بچے کے لیے گائے کا تازہ دودھ نکالنے باڑے میں چلی گئی۔ ام کلثوم بچہ کے کر بیٹھ گئی۔ دائی کمرے کی گندگی صاف کرنے لگی۔

محمد بی بی دودھ لے آئی اور بتی سے بچے کے حلق میں دودھ ٹپکانے لگی۔ تازہ دودھ پی کے بچہ سو گیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر محمد بی بی خوش خبری سنانے مردان خانے میں آ گئی اور اپنے شوہر سے کہنے لگی۔

"رفیق کے ابا_ مبارک ہو پوتا ہوا ہے۔"

"تجھے بھی مبارک ہو دادی بن گئی ہے"

عظیم خان نے بیوی سے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن رفیق کی کچھ خیر خبر نہیں ہے_ ہائے میرا پوتا ابا کسے کہے گا؟"

"تو فکر نہ کر بھلیے لوکے رفیق اور جمیل خیر سے واپس آ جائیں گے انشااللہ"

عظیم خان برکی نے بیوی کو تسلی دی۔

"بیڑا غرق ہو ان فرنگیوں کا ہمارے گاؤں کے جوان جنگ پر لے گئے ہیں۔ اللہ غارت کرے انہیں۔" بیوی بولی
"صبر کر_ صبر کر_ اللہ سے دعا کر"
عظیم خان نے بیوی کو دلاسہ دیا۔ "جا جا کر بہو کو دیکھ شاباش_ اسے طاقت والی غذا کھلا پلا تا کہ اس کی کمزوری دور ہو۔ بچاری کا پہلا بچہ ہے_ ساری رات تڑپتی رہی ہے_ خاوند بھی دور ہے_ اسے حوصلہ دے_ جا کر پیار کر" یہ سن کے محمد بی بی باورچی خانے میں چلی گئی اور بہو کے لیے دیسی مرغ کی یخنی بنانے لگی۔"
عظیم خان کی جدّی پشتی زمین تھی_ جس پر اس کے چھ بھائی اپنے دو بیٹے اور دو بیٹیاں، والدہ اور بیوی پل رہے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا_ رفیق اس کا بڑا بیٹا تھا_ رفیق کی شادی کو ایک سال ہوا تھا_ جب کہ جمیل اور باقی بچے کنوارے تھے۔ گاؤں کے دیگر نوجوانوں کے ساتھ اس کے دو بیٹے بھی برما کے محاذ پر جا چکے تھے۔ جنگ کے لیے سلطنتِ برطانیہ کے انگریزوں نے اور انکے ہندوستانی نمائندوں نے گھر گھر جا کر بھرتی کے لیے جوانوں کو تیار کیا تھا۔ فرنگیوں نے آزادی کا خواب دکھا کر جانوں کا نذرانہ مانگا تھا۔ اس وعدے پر کہ ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا

****

جاپانی بمبار ہوائی جہازوں سے بمباری جاری تھی۔ ان جہازوں کی تیز آواز اعصاب پر بجلی بن کر گرتی تھی۔
پلاٹون کمانڈر میجر جارج برٹن جاپانی حملے کے نتیجے میں مر چکا تھا۔
ہر طرف خوف وہراس چھایا ہوا تھا کسی وقت بھی جاپانی جہاز دوبارہ حملہ کر سکتے تھے۔
جنگ میں ہر طرف موت ہوتی ہے_ سپاہی چیونٹیوں کی طرح مرتے ہیں اور وہ دونوں مرنا نہیں چاہتے تھے۔
"اچھا موقع ہے بھاگ چلتے ہیں۔ جنگ نہ جانے کب ختم ہو گی"
چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا_ بڑا بھائی سوچ میں پڑ گیا اور بولا: "تو کہتا تو ٹھیک ہے_ اگر ہم یہاں رہے تو مارے جائیں گے۔"
خوش قسمتی سے دونوں بھائیوں کو معمولی زخم آئے تھے۔ جس وقت حملہ ہوا دونوں جنگی سامان کا حساب لکھ رہے تھے۔ دونوں وہیں پر سامان میں دبک گئے۔

دونوں نے دو خچر تیار کیے ضروری سامان باندھا_ اشیائے خوردونوش رکھی۔ ایک ایک بندوق کندھے سے لٹکائی اور خچروں کو ہانکتے ہوئے میدان کارزار سے باہر نکلے۔

پیچھے سے آواز آئی۔ "رفیق اور رفیق مجھے بھی لے چلو"

رفیق اور جمیل نے پلٹ کر دیکھا تو ان کے گاؤں کا رشید عرف شیدا تھا

"اچھا جا اس کے لیے بھی ایک خچر لے آ" اور ایک خچر اضافی بھی لے کر آ

رفیق نے چھوٹے بھائی جمیل سے کہا۔

شیدا زخمی تھا انہوں نے شیدے کی مرہم پٹی کی پھر دونوں نے مل کر شیدے کو خچر پر باندھا۔ اس کے لیے بھی خوراک کا بندوبست کیا۔ اور وہاں سے نکل گئے سب سے آگے بڑا بھائی رفیق اس کے پیچھے جمیل اس کے پیچھے شیدا اور آخر میں خچر جس پر بستر بند باندھ رکھے تھے۔ تین مرد اور چار خچر

یہ چلتے چلتے دور نکل آئے تو کان میں اذان کی آواز پڑی۔

یہاں رک کر نماز پڑھ لیتے ہیں_ قریب گاؤں بھی ہے۔ راستے کی معلومات بھی لے لیتے ہیں۔ رفیق نے مشورہ دیا گاؤں گھاس پھونس کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھا_ گاؤں کی آبادی کم تھی_ دبلے پتلے سانولے غریب کسان کھیتوں میں محنت مزدوری کرتے تھے_ وہ تینوں مقامی زبان سے ناواقف تھے اشاروں سے گفتگو کرتے رہے ۔ کھانا کھانے اور ستانے کے بعد وہ آگے روانہ ہوگئے_ کسانوں نے انہیں جو راستہ سمجھایا تھا اپنی دانست میں وہ اسی راستے پر چل رہے تھے_ فروری کا مہینہ تھا۔ دھوپ جسموں کو بھلی محسوس ہورہی تھی_ دھوپ میں چلنا ان کے لیے خوش کن تھا_ لیکن دشمن کے حملے کا خوف بھی دل کو دہلائے دے رہا تھا

****

برمنگھم، برطانیہ ۱۹۴۲

پیٹر بہت لگن سے لکڑی کے پشتے کاٹ رہا تھا۔ اس کی فرنیچر کی دکان تھی۔ وہ محنتی کاریگر تھا اس نے یہ کام ذاتی دلچسپی سے سیکھا تھا۔ وہ فرنیچر بنانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اسکی بیوی لارا ملنسار اور محبت کرنے والی عورت تھی اس کے دو بچے تھے۔ یہ برمنگھم کا ایک متوسط طبقے کا مطمئن گھرانہ تھا۔

موسم ابر آلود تھا۔ سردی کی

شدت رگوں میں خون منجمد کر رہی تھی۔ دھوپ کو ترسی ہوئی برطانیہ کی فضا ہمیشہ کی طرح یخ بستہ تھی۔ پیٹر کو اپنے کام سے غرض تھی اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی

"آج بھی دھوپ نہیں نکلے گی"

اس نے خود سے سرگوشی کی

پیٹر کا بچپن نامساعد حالات میں گزرا تھا۔ اسکا باپ شرابی اور جواری تھا۔ماں بیمار رہتی تھی۔وہ بچپن ہی سے محنت مزدوری کرنے لگا تھا۔ وہ بہت کم عمری میں ہی ماں کا داہنا ہاتھ بن گیا تھا۔ چھوٹے موٹے کام کر کے وہ پیسے کماتا۔ جس سے گھر میں راشن آتا اور اس کی ماں کی دوائی آتی_ باپ کی شفقت کی کمی نے اسے ذمہ دار اور بردبار بنا دیا تھا_ وہ سنجیدہ مزاج تھا شرارتوں کے لیے تقدیر نے اس کا انتخاب نہیں کیا تھا اس کی زندگی میں بچپن کا زمانہ گویا آیا ہی نہیں تھا_ وہ وقت سے پہلے ہی جوان ہو گیا تھا۔

شام ہوئی تو اس نے فالتو لکڑی کے ٹکڑے ایک بوری میں جمع کیے اور گھر کا رخ کیا_ یہ ٹکڑے آتشدان میں جلانے کے لیے تھے

oooooooooooo

ڈبہ والا ۱۹۴۲

صبح گیارہ بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کی فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی_ فروری کے دن تھے۔ مرد کھیتوں پر مصروف تھے۔ بچے گنے کھا رہے تھے_ عورتیں گھرداری میں مصروف تھیں_ بلی سائیں کھلا دروازہ دیکھ کر گھر میں داخل ہوا اور دودھ کی دیگچی منہ لگا کر پی گیا_ خالی دیگچی اس نے واپس رکھی۔ ڈکار لیا اور واپس ہو لیا۔

(ہائے میں مر گئی سارا ددھ پی گیا ہن میں نیانیاں نوں کی دواں گی)

"ہائے میں مر گئی سارا دودھ پی گیا اب میں بچوں کو کیا دونگی"

اپنی قسمت کا ماتم کر کے دلجیت کور ہانڈی پکانے لگی۔ گاؤں کے دروازے ہر کسی کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ یہاں تالے کی جگہ بھروسہ ہوتا ہے۔ بلی سائیں اسی کا فائدہ اٹھاتا جس گھر میں جی چاہتا گھس جاتا اور دودھ پی جاتا۔ اتنے میں بچے سو کر اٹھ گئے اور رونے لگے۔

اس نے دیوار کے پاس جا کر ہمسائی کو آواز دی اور دودھ مانگا۔ بچوں کو دودھ پلا کر وہ بلی سائیں کے گھر جا پہنچی۔ اس کی ماں کو بلی سائیں کی شکایت لگائی تو وہ کہنے لگی۔ "دیکھ دھی رانی وہ اللہ لوک ہے اللہ سائیں ہے۔ اس پر میرا زور نہیں چلتا تو نے جتنا دودھ لینا ہے۔ مجھ سے لے جا"

" اللہ سائیں ہے یا چور ہے دودھ چور ہے وہ ماسی "۔" دلجیت غصے سے بولی

"نہ نہ دھیے اس کو چور مت کہہ یہ تو اللہ کا سائیں ہے بچارے کا دماغ کام نہیں کرتا ہے "

"تو گھر پر رکھ اس کو"

آئندہ

آیا تو میں نے اسے چھڈنا نئیں"

دلجیت کور غصے سے بھری واپس آگئی۔

دوسرا باب:

فرار

وہ دونوں بھائی چلتے چلتے کئی میل کا فاصلہ طے کر گئے۔ راستے میں ایک گاؤں آیا۔ جس کے مکان جلے ہوئے تھے۔ جہازوں کی بمباری نے ہر شے تباہ کر دی تھی۔ انہوں نے گاؤں کے خالی گھروں میں کھانے پینے کے لیے خوراک کی تلاش کی۔ سوائے چوہوں کے کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک گھر میں شراب کی بوتل ملی جو ان کے لیے بے کار تھی۔ ان کے پاس خشک خوراک تھی اسی سے گزارہ کیا۔ وہاں سے نکلے اور چلنے لگے۔ رات ہو گئی تو انہوں نے دیکھا کہ سامنے ایک کنواں ہے۔

انہوں نے یہیں پر آرام کی ٹھانی۔ چاندنی رات تھی۔ ہر شے چاند کے نور میں بھیگی دکھائی دے رہی تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ سرد رات تھی۔ رفیق کو اپنی گھر والی یاد آنے لگی۔ بچاری مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ اس کی گھر والی حسنہ اسم با مسمی تھی- بہت خوب صورت اور عادات بھی بے مثل- جب رفیق جنگ کے لیے گھر سے نکلا تو حسنہ کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا اسے اس حال میں چھوڑ کر جانا رفیق کے لیے بہت مشکل تھا- حسنہ کو یاد کرتے کرتے رفیق کی آنکھ لگ گئی- اور پھر سردی کی شدت سے کھل گئی- ٹھٹھرتے ہوئے رات گزری۔

کبھی آنکھ لگ جاتی کبھی کھل جاتی-

وہ صبح صادق پر اٹھے اور کنواں کے ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنے لگے- زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی خوراک کھائی باقی رستے کے لیے بچائی۔ موسم کافی خنک تھا اور وہ سفر پر روانہ ہو گئے نہ ان کے پاس کوئی نقشہ تھا نہ کوئی اندازہ۔ بس اللہ توکل پر چلتے رہے۔

آدھا دن گزر گیا- سامنے ایک گھنا اور وسیع جنگل تھا۔ جو میلوں پر پھیلا ہوا تھا ایسے جنگلوں میں خونخوار جانور اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں- جنگل کی مرطوب فضا ان جانوروں اور پودوں کے لیے خوب سازگار ہوتی ہے۔ جنگل کے اندر بعض مقامات پر اس نوعیت کا اندھیرا بھی ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی کیونکہ درخت بہت گھنے ہوتے ہیں- جنگل کے اندر جانے کی بجائے اس کے ساتھ ساتھ چل کر کوئی سڑک تلاش کر لیتے ہیں۔ بڑے بھائی نے طے کیا اور وہ جنگل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے- ابھی چند فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ تین

ننگ دھڑنگ جنگلی نما مرد درختوں سے کود کر ان کے سامنے آ گئے اور اپنی خون آشام آنکھوں سے انہیں گھورنے لگے -ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔

oooooooooo

۱۹۴۲جالندھر ہندوستان

گھر میں جشن کا سماں تھا- آج کبیر

کا عقیقہ تھا- صحن میں چارپائیوں پر مہمان بیٹھے تھے۔ محمد بی بی نے گھر کی دیواروں پر تازہ لپائی کی تھی۔ سلیم کے پہلے سر کے بال مونڈھے گئے۔

بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی گئی - مانتا(امانت)نائی بیسن کے لڈو بنارہا تھا۔چارپائیوں پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھی۔مانتا قطار در قطار تازہ لڈو رکھتا جارہا تھا- تھوڑی دیر میں تینوں چارپائیاں بھر گئی۔

محمد بی بی نے ایک پلیٹ میں چار لڈو اور سات بوٹیاں گن کر رکھی اور گاؤں کے ہر گھر میں بھجوادی۔

برادری کو دعوت پر بلایا گیا اور عقیقے کا گوشت پکایا گیا۔

حسنہ کے والدین اور دیگر رشتہ دار دعوت پر مدعو تھے۔ حسنہ کا خاندان رفیق کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھا- حسنہ کا والد عبداللہ خان اور کزئی نورپور گاوں کا نمبردار تھا۔ اس کی زمینیں سب سے زیادہ تھی۔ وہ مربعوں کا مالک تھا- جب حسنہ کا رشتہ رفیق کے لیے آیا تو حسنہ کی ماں ام کلثوم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا پھر شوہر کے سمجھانے پر خاموش ہوگئی- اس کے شوہر کے خیال میں رشتہ کی بنیاد شرافت اور گوت پر رکھنی چاہیے۔مال و دولت کی اہمیت ثانوی ہے۔حسنہ گیارہ بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ سیدھے لمبے بال، سرو قامت، سرخ و سفید رنگت، متناسب جسم، خوبصورت نقش و نگار، ستواں ناک - اور عادات سونے پر سہاگہ ۔وہ بہت ملنسار، خدمت گزار اور مہمان نواز تھی۔

کئی رشتے آئے- تقدیر نے جوڑ رفیق کے ساتھ ملا دیا۔رفیق بھی حسنہ کا دیوانہ تھا۔ جس طرف جاتی اسے تکتا رہتا- اس زمانے میں پردے کا سخت رواج تھا - رفیق نے شادی کے بعد پہلی دفعہ حسنہ کو دیکھا تھا تو دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ حسنہ کے حسن کو ابھی جی بھر کے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ قسمت نے دونوں کو جدا کر دیا۔ حسنہ اس کی جدائی کے غم کو اندر ہی اندر سہتی رہتی اسے رفیق بہت یاد آتا تھا- وہ اکیلے میں رو کے جی کا بوجھ ہلکا کر لیتی مگر بظاہر خاموش رہتی

البتہ اس کے دل پر جو گزر رہی تھی وہی جانتی ہے - اس کے سسرال والے اس کا بہت خیال رکھتے تھے -ساس نے ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا اس کے باوجود اس کا دل بوجھل تھا- شوہر کی کمی ہر خوشی پر حاوی تھی-

رفیق کے باپ "عظیم خان برکی "کو اپنے افغان ہونے پر بہت مان تھا - ان کے اجداد افغانستان سے تقریباً سن ۱۲۰۳ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے یہ تاجر پیشہ تھے اور تجارت کی غرض سے ان کا ہندوستان آنا جانا لگا رہتا تھا- نسلاً افغان ہونے کے سبب یہ بہادر اور دلیر تھے - یہ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے - ان میں سے لودھی افاغنہ نے جب طاقت جمع کر لی تو ۱۴۵۱ میں دہلی کے تخت پر براجمان ہوئے۔ باقی قبیلوں کے پٹھان مختلف نوابی سلطنتوں کے مالک بنے۔

یہ افاغنہ ہجرت کرتے کراتے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے اور علاقائی زبانیں بولنے لگے - عظیم خان کے اجداد سن ۱۶۰۰ میں ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر میں آباد ہو گئے تھے۔

رفیق خان عظیم خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا - اس کا رشتہ علاقے کے سب سے اونچے پٹھان خاندان میں ہونا عظیم خان کے لیے بے حد طمانیت کی بات تھی - وہ جمیل کے لیے بھی ایسا ہی رشتہ چاہتا تھا۔ اس کے چاروں بچے رفیق، جمیل، صفیہ اور پروین بہت فرمانبردار تھے۔

oooooooo

۱۹۴۲ برطانیہ

پیٹر بے حد مصروف تھا۔ اسے جیمز گارلٹ کے گھر کا فرنیچر تیار کرنا تھا۔ جیمز گارلٹ نیا نیا ہندوستان سے انگلستان واپس آیا تھا۔ اس نے کلکتہ میں دس سال قیام کیا تھا - وہ چند ماہ سے شدید بیمار تھا - اسے بحری جہاز کے ذریعے واپس بھیج دیا گیا تھا - انگلستان میں جیمز کو نسل خانے میں اہم عہدے پر کام کرتا تھا - حکومت برطانیہ کی پالیسی کے تحت وہ اب انگلستان میں اس پوسٹ پر کام کرنے کا اہل نہیں تھا - جو انگریز ہندوستان بھیجے جاتے تھے_ برطانیہ واپسی پر انہیں جبری طور پر ریٹائر کر دیا جاتا تھا - کیونکہ گورے کی پالیسی کے مطابق وہ ایک غلام قوم میں کام کرنے کے بعد ترقی یافتہ قوم میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے - اب جیمز گھر اور کاروبار سیٹ کرنا چاہتا تھا اس کی عمر ۴۵ سال ہو چکی تھی وہ شادی کرنا چاہتا تھا - اپنے دکھ سکھ بانٹنے کے لیے اسے زندگی کا ساتھی درکار تھا۔

ooooooooooo

۱۹۴۲ڈبہ والا

دلجیت کور کا خاوند روزانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ جاتا تھا- وہاں وہ ایک کپڑے کی دکان کا مالک تھا-ڈبہ والا سے ٹوبہ ٹیک سنگھ دس میل کے فاصلے پر تھا- انگریزوں نے تقریباً ۴۶ سال پہلے ٹرین لائن کی پٹری بچھائی تھی جو کہ شورکوٹ، ڈبہ والا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ملاتی تھی۔ ۱۹۰۰ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کو تحصیل کا درجہ مل گیا- کاروبار کے مواقع زیادہ تھے۔ اس لیے قریبی دیہات کے مرد نوکریاں کرنے ٹوبہ ٹیک سنگھ جاتے تھے- دلجیت کا خاوند جگجیت سنگھ بھی ٹرین سے آتا جاتا تھا۔ ڈبہ والا اسٹیشن سرسبز و شاداب تھا- گاؤں تک پہنچنے کے لیے پگڈنڈی پر ڈھائی مربع پیدل چلنا پڑتا تھا- راستے میں نہر بھی تھی۔ نہروں کا جال بھی انگریز سرکار کا پھیلایا ہوا تھا۔ سادگی اور طمانیت کا زمانہ تھا- ہر طرف آسودگی ہی تھی۔ انگریزوں کی حکومت کا براہ راست اثر اس ساندل بار کے علاقے پر نہیں پڑا تھا- یہاں ریلوے لائن اور نہروں کا جال تو بچھا دیا گیا تھا لیکن دلی، لاہور اور بنگال والی افراتفری نہیں تھی۔

oooooooooo

۱۹۴۲برما

رفیق، جمیل اور شیدے کو جنگلی وحشی قبیلے نے چاروں طرف سے گھیر لیا- وہ ان تین افراد اور چار خچروں کو ہانکتے ہوئے جنگل کے اندر لے گئے۔ گھنا اور تاریک جنگل تھا- تقریباً پانچ میل چلنے کے بعد چند غاریں نظر آئی- یہ قدرتی غاریں تھیں جو کہ اس جنگلی قبیلے کے استعمال میں تھیں- درختوں کے ساتھ مسلمان، سکھ اور ہندو فوجی بندھے ہوئے تھے- ان تینوں کو بھی درختوں کے ساتھ باندھ دیا گیا- شیدے کی ٹانگ زخمی تھی لیکن اسے کوئی رعایت نہیں دی گئی- پہلے موجود فوجیوں کی تعداد بیس تھی اب یہ تیئس ہو گئی- اب کیا ہو گا!

یہ سوال سب کو خوف زدہ کر رہا تھا-

یہ وہ فوجی تھے جو حملے کی صورت میں اپنی پلاٹون سے الگ ہو گئے تھے- کچھ پیچھے رہ گئے کچھ بچھڑ گئے۔ کچھ زندگی بچانے کے لیے بھاگ گئے تھے۔

اس جنگلی قبیلے کا سردار بہت ظالم اور سخت دل انسان تھا- اس کا سب پر خاصا رعب تھا- اپنی زبان میں چیخ چیخ کر بات کم کرتا اور حکم زیادہ چلاتا- فوجیوں میں زیادہ تعداد عام کسانوں کی تھی جن کو انگریز آقا نے جنگ میں

جھونک دیا تھا- جنگ ان کی منزل نہیں تھی ان پر مسلط کر دی گئی تھی۔ موت ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ وہ اپنے گھروں سے میلوں دور اس جنگل میں تقدیر کے اگلے وار کے منتظر تھے -ان کے کھیت کھلیان، ٹبے، ٹوئے، کچی پگڈنڈیاں ان کو یاد آتی تھیں -ناامیدی، مایوسی اور تھکاوٹ نے سب کو بے حال کرر کھا تھا کہ فضا میں شور کی تیز آواز گونجنے لگی۔

oooooooooo

ڈبہ والا ۱۹۴۲

اس دن جگجیت سنگھ کو واپسی پر دیر ہو گئی۔ دلجیت کور کی آنکھیں دہلیز سے لگی ہوئی تھی سورج غروب ہو گیا اندھیرا چھانے لگا تو جگجیت واپس لوٹا۔

"کہاں رہ گیا تھا تو"

"آج جلسہ تھا بس یار بیلی ساتھ لے گئے"

"کیسا جلسہ "؟ ہندوستان کے بٹوارہ کی باتیں ہو رہی تھی وہی سن کر آگیا ہوں -

"ہندوستان بٹ گیا تو ہمارا یہ پنڈ۔ اس کا کیا بنے گا؟ یہ ڈبہ والا ہمارا پنڈ؟

ٹیک سنگھ کا ٹوبہ بھی بٹ جائے گا کیا"؟

دلجیت کور نے سوال کیا؟

"ٹوبہ کیسے بٹ سکتا ہے اس کو تو ٹیک سنگھ نے آباد کیا ہے"

"ٹوبہ کا کیا مطلب ہے -تجھے پتا ہے نا؟؟

جگجیت سنگھ نے پوچھا؟

"ہاں بالکل ٹوبہ کا مطلب وہ گڑھا ہے جس کے جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے -

ٹوبہ ٹیک سنگھ نے ٹوبہ کے ارد گرد جگہ کھود کر بڑا سا ٹوبہ بنوایا تھا اور مٹی کے بہت سے مٹکے اپنی جیب سے خرید کر وہاں رکھے تھے اور ان میں پانی جمع کر دیا تھا وہ ان مٹکوں کو خالی نہیں رہنے دیتا تھا پانی سے بھر تا رہتا تھا اور یہاں (بوڑھ) کے درخت بھی لگوائے تھے"-

"دلجیت تجھے پتا ہے -اس نے ایسا کیوں کیا تھا"

"وہ نیک بندہ تھا"

ہاں نیک ماں کی اولاد تھا رحم دل بندہ تھا- ٹیک سنگھ نے یہ اس لیے کیا تھا کہ کیونکہ یہ جگہ ٹوبہ ٹیک سنگھ وسطی پنجاب میں ایک تجارتی گزرہ گاہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اہم مقام ہے- یہاں سے گزرنے والے قافلوں اور ان کے جانوروں کو پینے کے پانی کا مسئلہ تھا۔ اس کی اس نیکی کے بعد

ہندوستان سے افغانستان اور وہاں سے ہندوستان جانے والے مسافر یہاں پڑاؤ کرتے، آرام کرتے، پانی پیتے اور اپنے ساتھ بھی لے کر جاتے تھے- ٹیک سنگھ ہر روز ان مٹکوں کو بھرتا رہتا اور ساتھ اپنی زمینوں پر کام بھی کرتا تھا"-

اس کے نام پر جگہ کا نام ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑ گیا ہے- نیک بندے کی نیکی زندہ رہتی ہے ہمیشہ-"

جگجیت سنگھ نے سمجھایا- "

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہندوستان تقسیم کیسے ہو گا؟

یہ فرنگی ہمیں جینے نہیں دیتے کیا یہ چھوڑ دیں گے ہمارا ملک؟

دلجیت کور نے پوچھا پھر مایوس ہو کر بولی۔

"جگجیتے چل چھڈ- تو روٹی کھالے بھوکا ہو گا تو"-

اور اٹھ کر روٹی ٹکر لینے چلی گئی-

oooooooooo

برما۱۹۴۲

جاپانی جہازوں کی بمباری سے جنگل گونج اٹھا- قیدیوں میں زخمی جوان بھی تھے- قیدی جن درختوں سے بندھے ہوئے تھے- ان سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر خشک لکڑیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا- یہ ان جنگلیوں نے ایندھن اور دوسروں کاموں کے لیے جمع کر رکھا تھا- منوں کے حساب سے

خشک لکڑیاں ان لوگوں نے جنگل سے توڑ کر جمع کی تھی- اچانک جاپانی ہوائی جہاز سے ایک بم اس ڈھیر پر گرا اور دفعتاً آگ بھڑک اٹھی- سارے جنگلی لکڑیوں کی طرف بھاگے اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے- کچھ پانی والے برتن اٹھا کر قریبی چشمے کی طرف بھاگے کچھ ریت بھر بھر کے آگ پر ڈالنے لگے۔ چشم زدن میں آگ

پھیلتی گئی-لکڑی خشک تھی آگ کے شعلے آسماں سے باتیں کرنے لگے-ایک قیدی جو رات سے رسی ڈھیلی کر رہا تھا- اس نے اپنے ہاتھ آزاد کروالئے پھر پاؤں کے بند کھولے -وہ باقی قیدیوں کو کھولنے لگا-اس نے سب کو خاموشی سے پیچھے آنے کا اشارہ کیا- آہستہ آہستہ وہ سب پیچھے کی طرف ہٹنے لگے - تھوڑا آگے جاکر انہوں نے رفتار تیز کی لیکن اب مسئلہ زخمیوں کا تھا-زخمیوں کی وجہ سے ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی-زخمیوں کو سہارے سے چلانا پڑ رہا تھا-ہمت کر کے وہ اس جگہ سے دور نکل آئے شام ڈھل رہی تھی- بھوک اور پیاس سے ان کا برا حال تھا- یہ ایک برساتی جنگل تھا جس میں وہ اس وقت سفر کر رہے تھے جنگل کی مرطوب فضا اور اندھیرے راستوں پر بندروں کی کثیر تعداد تھی جن کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا-انہوں نے درختوں پر بیل گری کا پھل لگا دیکھا لیکن یہ ابھی کچے تھے-بیل گری کا پھل اپریل میں کھانے کا قابل ہوتا ہے-

آندھی سے جو پھل درختوں کے پاس گرے ہوئے تھے-وہ وہی کھانے لگے- پھل ترش تھے-کچھ پیٹ پوجا ہوگئی تو جنگلی جانوروں کا خوف ستانے لگا- پھر اٹھ کے چلنے لگے۔نہ انہیں راستے کی خبر تھی نہ کوئی نقشہ انکے پاس تھا-بس خدا کے بھروسے چل رہے تھے کہ چند غاریں نظر آئیں-

"رات کسی غار میں گزار لیتے ہیں" ایک قیدی بولا

"غاریں بنگالی ٹائیگرز کا مسکن ہوتی ہیں"-دوسرے قیدی نے اطلاع دی-اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں- یہیں سو جاتے ہیں-دو آدمی جاگتے رہیں اور باری باری سب پہرہ دیں-

وہ لوگ وہی پر لیٹ گئے پہرے کی ذمہ داری رفیق اور جمیل نے اٹھائی-

رات کا پچھلا پہر گزر رہی تھا کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔رفیق چوکنا ہوگیا

"جمیل کچھ ہے اس طرف کچھ ہے۔"

رفیق نے اشارے سے بتایا۔

دفعتاً انہیں ایک بنگالی ٹائیگر نظر آیا جو ان کی طرف بڑھ رہا تھا رفیق نے جمیل کو آواز دی۔جمیل نے شور مچادیا

"اٹھو!اٹھو!شیر شیر

شیر آگیا ہے"

اس کی چیخ و پکار سن کر سب اٹھ گئے -شیر نے ان کے ایک ساتھی پر چھلانگ لگائی اور اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کا سینہ نوچنے لگا رفیق اور جمیل اس آدمی کو چھڑانے لگ -ے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا -ان کا سب سامان جنگلیوں نے ہتھیا لیا تھا- جمیل شیر کی دم کھینچنے لگا اور رفیق شیر کو دھکیلنے لگا- شیر نے اس آدمی کی گردن اپنے منہ میں دبانے والا تھا کہ ایک آدمی نے سوکھی لکڑی جو درخت کی شاخ تھی اس شیر کر سر پر دے ماری۔

یک دم شیر غرایا اس نے اپنا شکار چھوڑا اور چھلانگ لگا دی جس طرف چھلانگ لگائی اس طرف بچارہ شیدا لیٹا ہوا تھا۔ شیر نے شیدے کو منہ میں دبوچا اور جنگل کے اندر بھاگ گیا -شیدا زخمی تھا مزاحمت نہ کر سکا شیر فرار ہو گیا-

"ہائے شیدا

شیدا گیا"

جمیل نے دہائی دی

سب افسردہ ہو گئے۔

رفیق کو شیدے کے بڑھے والدین اور منگیتر کی فکر ستانے لگی کیا کہوں گا کیسے خبر دونگا اس نے دل میں سوچا۔

سب پریشان اور نڈھال تھے۔

کیا ہم زندہ سلامت گھروں کو پہنچ سکیں گے ؟

یہ ہی سوچ اس وقت ان سب کے دماغوں میں تھی۔

وہ عام کسان تھے -زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے -اپنی زمینوں پر کھڑی فصلیں چھوڑ کر آئے تھے۔ آئے کہاں تھے۔ زبردستی لائے گئے تھے -انہیں اپنے کچے گھر یاد آتے تھے - گاؤں کی پگڈنڈیاں ان کی منتظر تھیں۔ بوڑھی آنکھیں، جوان بیویاں اور انکے کم سن بچے ان کے لیے دعائیں کرتے تھے -منگیتر اور محبوبائیں ہاتھوں کی لکیروں میں ان کی واپسی کے نشان ڈھونڈ رہی تھی-

لکڑی کے جلتے چولہے سے اٹھتا سرمئی دھواں انکی ماؤں کے کلیجوں کو بھی کالا کرتا جاتا تھا- انکی ماؤں کی آنکھیں برستی تھی اور بیٹوں کی کوئی خیر خبر نہ تھی-

وہ موت کے منہ میں مایوس، بھوکے، نڈھال اور بے آس پڑے تھے -ان کے آنسو انکے دلوں پر گرتے تھے - رقتِ قلبی سے ان کی آنکھیں پُرنم تھیں انہیں ایک ایسی جنگ میں جھونک دیا گیا تھا جو ان کی تھی ہی نہیں-

غلامی کا یہ طوق کتنی صدیوں تک ان کی اولاد کے گلے میں پڑنے والا تھا انہیں خبر نہیں تھی- سلطنتِ برطانیہ کے یہ غلام، یہ حقیر انسان یہ ہندوستانی
کیاہے ان کی اہمیت!
شیروں کے خوف کی وجہ سے وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے- انہوں نے جیسے تیسے رات گزاری - صبح اٹھ کر جو مسلمان تھے وہ نماز پڑھ کر دعا کرنے لگے سکھ، ہندو اپنی عبادت کرنے لگے۔
بھوکے پیاسے نقاہت کے مارے ہوئے یہ ۱۲۲ افراد ان غاروں کو جو شیروں کی کچھاریں تھیں- چٹانوں کے اندر بنی ہوئی تھیں
عبور کر کے دوسری سمت نکل گئے-
کچھ فاصلے پر ایک برساتی نالہ تھا جس کا پاٹ کافی چوڑا تھا- انہوں نے وہاں منہ ہاتھ دھویا اور پانی پیا کہ ایک مقامی شخص نظر آیا- انہوں نے اشارے سے کھانا مانگا- وہ خدا ترس آدمی انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا- اس نے انہیں کھانا کھلایا اور راستہ بتانے کے لیے ان کی رہنمائی کے لیے ساتھ چل پڑا- دو میل چلنے کے بعد وہ انہیں پکی سڑک پر چھوڑ گیا اب وہ سب کسی سواری کے منتظر تھے-

ooooooooo

برطانیہ ۱۹۴۲

ہندوستان سے برطانیہ واپس جانے والے بے شمار انگریز گھرانے ایسے تھے جن کے باپ دادا نے ہندوستان میں انتظامی ڈھانچے کی پوسٹوں پر کام کیا تھا- اور ہندوستان میں ٹھاٹ بھاٹ سے شاہانہ زندگی گزاری تھی- برطانیہ واپس جانا ان میں سے کچھ کو سخت ناپسند تھا برطانیہ کے تنگ رہائشی مکان اور ملازمین کی عدم دستیابی ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی لیکن مجبوری بحکم سرکار پر یہ واپسی پر مجبور تھے۔ جیمز گارلٹ بھی ان میں سے ایک تھا- وہ ایک باتونی آدمی تھا_ وہ پیٹر کو ہندوستان کے قصے سناتا رہتا تھا-
پیٹر تن دہی سے اپنے کام میں مصروف تھا- اس نے جیمز گارلٹ کا سامان تیار کر دیا تھا- فرنیچر اب اختتامی مرحلے میں تھا- پالش کا کام جاری تھا- جو کہ ایک گھنٹہ میں مکمل ہونے والا تھا- گھنٹہ بعد جیمز آگیا اس کے ساتھ ایک طرح دار درمیانی عمر کی عورت بھی تھی- عورت کی عمر تو چالیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن اس کی دراز قد

قامت اور چھریرے بدن نے اس کو عمر کو چھپا رکھا تھا وہ بمشکل تیس سال کی لگ رہی تھی۔ جیمز اسے ایک ایک چیز دکھانے لگا عورت کی نظروں میں ستائش دیکھ کر جیمز بہت خوش ہوا اس نے پیٹر کو طے شدہ معاوضے سے زیادہ رقم ادا کی اور سامان لوڈ کروانے لگا-

جمیز کا مکان سامان سے سج گیا- جمیز گارلٹ نے میری (جو عورت سامان لیتے وقت ساتھ تھی) سے شادی کر لی- اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے-

oooooooooo

۱۹۴۲ جالندھر

کریم خان کو اپنے دونوں بیٹوں رفیق اور جمیل کی بہت فکر تھی لیکن وہ گھر کے عورتوں کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرتا تھا- وہ ہر نماز میں اپنے بیٹوں اور سارے ہندوستان کے جوانوں کے لیے دعا مانگتا- پھر مسلمانوں کے لیے دعا مانگتا- اسے یقین تھا کہ ایک دن اس کے بیٹے لوٹ آئیں گے۔

وہ پوتے کو پیار کرتا اور دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں دیتا تھا- اس کے بیٹوں کے ساتھ گئے باقی جوانوں کے والدین بھی بہت فکر مند تھے۔

دوسری جنگ عظیم میں ۲۵ لاکھ ہندوستانی سپاہی تاج برطانیہ کیلیئے جنگ کے میدانوں میں بھیجے گئے تھے- جن میں سے ٦ لاکھ مسلمان تھے۔

یہ بد نصیب ہندوستانی غلام جن میں سے بے شمار کی بے گور و کفن لاشیں مختلف محاذوں پر پردیس میں گل سڑ گئی تھی- یہ وہیں موت کی نیند سو گئے تھے- انکے گھر والوں تک ان کی موت کی اطلاع بھی نہ پہنچ سکی۔ ان کا انتظار تا عمر انتظار ہی رہا-

ooooooooooo

جگجیت کور شہر جاتا اور رنگ برنگی سیاسی خبریں سنتا رہتا تھا- گاؤں میں تو نہ ریڈیو تھا نہ اخبار آتا تھا۔ گاؤں کی زیادہ تر آبادی ناخواندہ تھی۔ صرف ڈاکیا پڑھنا جانتا تھا جو گاؤں کے باشندوں کے خط، تار اور منی آرڈر پڑھتا تھا۔ سب خبریں شہر ہی سے ملتی تھیں۔

ریڈیو سے نشر ہونے والی جنگ کی خبریں عوام کو خوف زدہ کر رہی تھی - جاپانیوں کے قبضے کا خوف ستائے رکھتا تھا۔ بمباری کے واقعات حیران کرتے تھے - فرنگی حکمرانوں نے ہندوستان کی دولت لوٹ کر سلطنتِ برطانیہ کی خدمت میں بحری جہازوں کے ذریعے بھیج دی تھی - نوابوں، راجاؤں، مہراجاؤں کو شکست دے کر وظیفہ خوار بنالیا گیا تھا- مغلوں کے آخری بادشاہ کو رنگون بھیج دیا- جہاں وہ وفات پاگئے تھے - عورتیں بے پردہ ہوگئی۔ مرد کلرک لگ گئے -ہندوستان کا انتظامی ڈھانچہ، تعلیمی نظام سماجی اقدار بہت تیزی سے بدلے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا قیام عمل میں لایا گیا- کالج کے قیام کا ایک مقصد تو کمپنی کے ملازمین کو ہندوستان کے سماج اور ہندوستانی زبان سے واقفیت دلانا تھی انگریزوں کو ہندوستان پر حکومت کے لیے کمپنی کے ملازمین کی مقامی زبانوں اور ماحول سے آگاہی ضروری تھی۔ اس کے لئے تعلیم و تربیت کا باقاعدہ انتظام فوڑت ولیم کے ذریعے سے کیا گیا۔ دوسری طرف اس کالج کے قیام کا ایک مقصد فارسی کی حاکمیت کم کر کے مسلمانوں کو ان کے مرکز سے ہٹانا بھی تھا- زبان ہمیشہ حکمران طبقے کی رائج ہوتی ہے۔ بکسر کی جنگ کے بعد مسلمانوں کا اقتدار کمزور ہوا تو فارسی زبان بھی قدر کھونے لگی۔ اس کالج کے تحت ذریعہ تعلیم اردو زبان کو ٹھہرایا گیا تھا۔

کالج کے قیام کا ایک مقصد تصنیفات کے ذریعے سے اس وقت کی ہندوستانی رعایا کے دلوں پر قابض انگریزی حکومت کی شان و شوکت، رعایا پروری، علم دوستی، انصاف پسندی اور عوام سے ہمدردی جیسے خیالات کو فروغ دینا تھا۔ اس کالج کے تحت مطبوعہ کہانیاں، تاریخ، شاعری اور قانون جیسی اصناف میں خوب اضافہ کیا گیا۔

اس کالج کے ذریعے تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کلاسیکی زبانوں کی مشہور اور مقبول کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کالج میں لفظی ترجمے کی بجائے مفہوم کو اردو کے جامے میں ڈھالا گیا۔ بہت سی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ، میر علی بہادر حسینی، میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مظہر علی دلا، مرزا کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین احمد، خلیل خان اشک، نہال چند لاہوری، بنی نارائن جہاں، مرزا جان طپش، میر عبد اللہ مسکین، مرزا محمد فطرت، میر معین الدین فیض نے کتب تصنیف کی۔

فارسی مغلوں کی زبان تھی۔ اس پر مسلمانوں کی زبان کا ٹھپہ لگ گیا- انگریزوں کو فارسی سے نفرت تھی۔ انہوں نے فارسی کو مٹانے کے لیے اردو زبان کی ترویج کی۔ فورٹ ولیم کالج میں چھاپہ خانہ لگائے گئے۔ ہندی، انگریزی

کی کتابوں کے اردو میں تراجم کیے گئے۔ انگریزوں نے اپنا منتخب کردہ نصاب چھاپا ایسا نصاب جس سے ہندوستانیوں کی ذہن سازی کی جاسکے۔ نوجوان نسل کو گمراہ کیا جاسکے۔ اور نوجوان نسل کو اسلاف سے برگشتہ کیا۔

نئے آقا نیا نظام لاتے ہیں اور اب ہندوستان کسی نئے نظام اور نئے آقا کی غلامی کے لیے تیار نہ تھا۔

دوسری طرف آزادی کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی - برطانوی طاقت دو عظیم جنگیں لڑ کر کمزور ہو چکی تھی - مسلمان جناح اور ہندو گاندھی جی کے ہم نوا بن چکے تھے۔ ان محفلوں کو اس وقت چار چاند لگ جاتے جب کوئی بابو (کلرک) ان محفلوں میں شامل ہو جاتا - جگجیت سنگھ کو بابو بہت پسند تھے لیکن وہ ان پڑھ تھا اس لیے بابو نہ بن سکا - اپنے بیٹے کو بابو بنانے کے خواب وہ ضرور دیکھتا تھا -

آنے والی دہائیوں میں انہی کلرکوں کی نسلیں مڈل کلاس کی شکل اختیار کر گئی

ooooooooooo

جگجیت کے گاؤں سے کوئی جنگ پر نہیں گیا تھا - جگجیت سنگھ کا گاوں ڈبہ والا، ٹوبہ ٹیک سنگھ، جھنگ، فیصل آباد میں انگریزوں کی کوئی چھاؤنی نہیں تھی -

"جگجیت کا گاؤں ساندل بار کے قلب میں واقع تھا - ساندل بار کا علاقہ مغربی پنجاب میں رچنا دوآبہ میں ھے۔ بار سے مراد وہ گھنا جنگل ہے - جہاں نہری پانی موجود نہ ہو -- اس بار کے تین نام ہیں - ساندل بار، دُلا بھٹی کی بار، جھنگ بار - ۱۸۹۲ میں انگریزوں نے یہاں نہروں کا جال بچھایا - ساندل بار پنجابی ثقافت کا گھر ہے - اس بار میں دلا بھٹی، بھگت سنگھ، رائے احمد کھرل نے جنم لیا -- یہ سب باروں سے بڑی ہے -۔ انگریز نے ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قبضہ کیا تو یہ علاقہ بے آب و گیاہ تھا۔ ہر طرف ریت کے ٹیلے تھے اور ببول کے درخت۔ بارش بہت کم ہوتی تھی۔ یہ خطہ فیصل آباد، جھنگ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، چنیوٹ، ننکانہ صاحب، حافظ آباد اور شیخوپورہ کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ پنجابی زبان کا جھنگوچی لہجہ پنجابی کا سب سے پرانا لہجہ ھے۔ یہ ٹھیٹھ پنجابی زبان ہے جو اس علاقے میں بولی جاتی ہے - جنگ سے متعلق جگجیت کی معلومات ریڈیو تک ہی محدود تھیں -

oooooooooooo

وہ سڑک پر منتظر تھے کہ اچانک گرد اڑنے لگی - یہ گرد کسی فوجی کانوائے کی آمد کا پتا دے رہی تھی -

"جلدی سے چھپ جاؤ کہیں جاپانی نہ ہو - وہ ہوئے تو ہمیں قید کر لیں گے "

ان میں سے ایک نے صلاح دی-

"یہ ٹھیک ہے چلو چلو درختوں کی اوٹ میں چلیں"۔

دوسرا بولا

وہ بھاگ کر سڑک کے ساتھ لگے درختوں کے تنوں کے پیچھے چھپ گئے-

آہستہ آہستہ کانوائے نزدیک آگیا- ان کی خوش قسمتی رہی- کہ آنے والا کانوائے برطانوی فوج کا فوجی کانوائے تھا- ساتھ میں ان کے ہم وطن بھی تھے- وہ باہر نکلے اور پلاٹون کمانڈر کے سامنے پیش کیے گئے۔ پلاٹون کمانڈر زخمی حالت میں بھی فرائض نبھارہا تھا-

جاپانیوں کے حملے میں وہ زخمی ہوا تھا لیکن جی دار بندہ تھا- وہ مذہباً گجرات کا پارسی تھا-

زندہ دل اور سمجھ دار فوجی افسر تھا-

ان سب کی رجمنٹ اور رینک پوچھے گئے- گزشتہ لڑائی کے واقعات سنے گئے اور انکے نام لسٹ میں شامل کیے گئے اور انہیں کانوائے میں رہنے کی اجازت مل گئی-

وہ خوش ہو گئے کہ کھانا تو ملے گا لیکن لڑائی کا خوف بھی دہشت زدہ کر رہا تھا- اس کے باوجود وہ مطمئن تھے کہ کم از کم بے نام و نشان نہیں مریں گے -گھر والوں تک اطلاع تو پہنچ جائے گی- چند گھنٹوں بعد وہ دریائے سیتاونج کے کنارے پہنچ چکے تھے- یہاں پہاڑی پر ایک "پگوڈا" تھا- اسی مناسبت سے اسے پگوڈے والی پہاڑی کہا جاتا تھا- کھانا پکایا گیا ان سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر ان سب کو پگوڈے کی خالی عمارت میں آرام کا کہا گیا- تین دن پہلے وہاں شدید لڑائی ہوئی تھی مقامی آبادی وہاں سے کوچ کر چکی تھی- وہ سب پگوڈے کی عمارت میں جا کر گہری نیند سو گئے-

تھکے ماندے جسموں اور جاگتی ہوئی آنکھوں کو اب کہیں جا کر آرام ملا تھا-

دو دن وہاں قیام کیا گیا پھر تازہ دم ہو کر وہ آگے بڑھنے لگے-

دشوار راستے ان کے منتظر تھے- وہ بے نام منزلوں کے مسافر تھے-

انہیں سارا دن برما کے جنگلوں، وادیوں اور بیابانوں میں پھرتے پھرتے کئی ماہ گزر گئے-

جنگی سفر کی صعبتوں نے انہیں پژمردہ کر دیا تھا-

راستے میں جلے ہوئے مکان انہیں خوف زدہ کرتے تھے۔ اجڑے ہوئے قصبے اپنی بربادی کا نوحہ سناتے تھے -گلی سڑی لاشیں اپنی بے وقعتی پر ماتم کناں تھیں-

یہ دیکھتے دیکھتے ۱۹۴۳ شروع ہو گیا-

وہ کھل کر انگریزوں کی اس مسلط شدہ جنگ پر تنقید نہیں کر سکتے تھے - فوج میں کثیر تعداد انگریزوں کے جاسوسوں کی تھی جو پل پل کی خبریں پہنچا کر انعامات وصول کرتے تھے - ہندوستانیوں کی اس نمک حرامی اور اپنوں سے غداری نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی راہ ہموار کی تھی -

یہی وجہ تھی کہ وہ انگریزوں کی مدح سرائی پر سر دھنتے -

جب نعرے لگتے وہ بھی جوش و خروش سے ہاتھ لہراتے -سلطنت برطانیہ کی غلامی پر تالیاں پیٹتے۔ گھنے جنگلوں میں چھپی ہوئی دلدل کئی فوجیوں کو نگل چکی تھیں -موسلا دھار بارشیں بہت ساروں کو بیمار کر چکی تھیں -موسم کا اتار چڑھاؤ جب ان کو بیماریوں میں مبتلا کر دیتا تو دوائیوں کی عدم دستیابی اور اچھی خوراک کی کمی مزید مسائل پیدا کرتی -کچھ جو ان تو سہہ گئے لیکن بہت سارے مر گئے -جنگلی جانوروں کا خطرہ انہیں چوکس رکھتا تھا -دشمن کا فضائی حملہ ہوتا تو بھگدڑ مچ جاتی۔ دریا اور ندیاں جن میں دریائی مگر مچھوں کی بڑی تعداد تھی -یہ قوی ہیکل مگرمچھ بہت خون خوار تھے -ان مگرمچھوں کا خوف، پھندے، بھوک، پیاس، بیماری اور غریب الوطنی کے باوجود ان کا پلاٹون کمانڈر اپنی فوج کو بڑے بڑے پہاڑوں کے نشیب و فراز میں سے گزارتا ہوا آسام کی طرف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا وہ خوش قسمت تھے کہ تقریباً ایک سال دس ماہ کے بعد اپنے وطن ہندوستان واپس لوٹ آئے تھے -

oooooooooooo

پیٹر اپنی دکان پر کام کرتا تو اس کی نظر دوسری جنگ عظیم سے واپس انگلستان آئے ہوئے فوجیوں پر پڑتی تھی -وہ انہیں بغور دیکھتا جو تندرست تھے -وہ خوش قسمت تھے -لیکن سب خوش قسمت ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ جو بد قسمت تھے وہ عمر بھر کے لیے معذور ہو چکے تھے کچھ نابینا ہو چکے تھے۔ کسی نے ٹانگ گنوائی کسی نے بازو -کچھ نفسیاتی مریض بن چکے تھے -جنگ کی دہشت بہت کچھ نگل چکی تھی -

کچھ فوجیوں کی بیویاں تنہا نہیں رہ سکی -وہ بے وفا ہو چکی تھی کچھ جو باوفا تھی -ان کے شوہر جنگ میں مارے جا چکے تھے -کچھ یتیم بچوں کو لیے بیٹھی تھی -حکومت برطانیہ میڈلز اور پاؤنڈز کی بندر بانٹ میں مصروف تھی -سب

سے بڑا فوجی اعزاز وکٹوریہ کراس تھا جو سترہ ہندوستانیوں کو بعد از مرگ دیا گیا- دوسری طرف محکوم ممالک تیزی سے سلطنتِ برطانیہ کے ہاتھ سے پھسل رہے تھے -

نو آبادیات پر اب قابو رکھنا محال ہو رہا تھا-،

بہت کچھ بدلنے والا تھا-

مسولینی کی موت اور ہٹلر کی خود کشی نے جنگ کا منظر نامہ تبدیل کر دیا- بظاہر تو جاپان نے ہتھیار ڈالے تھے لیکن برطانیہ کی گرفت کمزور ہو چکی تھی - سلطنت برطانیہ کی فوج کی ایک تعداد جس پر سورج غروب نہیں ہو تا تھا- جنگوں اور قبضوں میں کٹ مر چکی تھی-

جنگ کے بعد بے پناہ قتل و غارت ہوا لوگوں نے ہجرت کی - بے روز گاری بڑھی۔ قحط ہوا- غربت اور بیماریوں وغیرہ سے ہزاروں افراد مر گئے۔ لاکھوں افراد معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کا شکار بن گئے تھے۔

تیسرا باب

واپسی

عظیم خان برکی کے گھر جالندھر پنجاب میں آج جشن کا سماں تھا-اس کے گھر کا کچا صحن مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔
اس کے بیٹے پونے دو سال بعد واپس لوٹے تھے-اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیا کرے۔
صدقے کے بکرے ذبح کیے گئے۔رشتہ داروں کی دعوت کی گئی-پوتے کی رسم مسلمانی ادا کی گئی۔محتاجوں پر دل کھول کر خرچ کیا گیا۔
حسنہ کے والدین نے بھی خوب صدقہ خیرات کیا۔
رفیق نے ننھے کبیر کو بانہوں میں لیا تو ساری تھکان اتر گئی۔کبیر پہلے تو گھبرایا-رفیق کی مضبوط گرفت میں مچلتا رہا پھر آہستہ آہستہ شانت ہو گیا۔باپ کے خون کی گرمی اس کے جسم میں جذب ہوئی تو وہ پرسکون ہو گیا۔
رفیق کی خوش قسمتی کہ سردیوں کا موسم تھا-سب اندر کمروں میں سوتے تھے۔دن بھر رفیق چور نظروں سے حسنہ کا دیدار کرتا رہا۔اس کے ارد گرد رشتہ داروں کا گھیرا تھا-جب رات ہوئی تو رفیق کی دلی مراد بھی بر آئی-حسنہ کو بانہوں میں بھرا-اس نے بھی شرما کر رفیق کے سینے میں سر چھپا لیا۔
رفیق کے بوسوں کی بوچھاڑ میں رات دھیرے دھیرے بھیگ رہی تھی-حسنہ کے تشنہ،منتظر بدن کو جوان مرد کی قربت پگھلا رہی تھی۔وہ سرتاپاؤں سرشاری اور شادمانی کے جھولے میں جھول رہی تھی۔
"تو بہت یاد آتی تھی جب تھک جاتا تھا تجھے بانہوں میں بھر لیتا تھا-"
رفیق نے سرگوشی کی۔
"میں بھی دن رات دعائیں کرتی تھی"
حسنہ بولی-"رب نے ہمیں ملا دیا-اسکا جینا(جتنا)شکر ادا کریں کم ہے
"جی۔" -حسنہ نے کہا
سب خوش تھے-بس وہ گھرانے جن کے پیارے مارے گئے-غم گین تھے-شیدے کی شیر کا شکار بننے کی خبر رفیق خان برکی نے جیسے اس کے والدین کو دی-وہی جانتا ہے کہ اس کے دل پر اور سننے والوں کے قلوب پر کیا

گزری لیکن اطلاع تو پہنچانا تھی -شیدے کے بوڑھے والدین ڈھے سے گئے -شیدے کے گھر صف ماتم بچ گئی برادری والے افسوس کے لیے آنے لگے۔ مشیت ایزدی کے سامنے انسان بے بس ہے۔بے کس و محتاج ہے۔ کس کو دوش دیں؟ کس کا گریبان پکڑیں۔ہندوستانی لوگوں کی فطرت کے مطابق شیدے کے والدین بھی "جو اللہ کی مرضی" کہہ کر چپ ہو گئے۔

تقدیر برحق ہے جس کی جتنی عمر لکھی ہے -وہ اتنی ہی گزار کر دنیا سے جاتا ہے۔ لیکن یہ جنگ کی آگ تو انسانوں کی لگائی ہوئی ہے -جو برصغیر کی زمین پر کئی سال گزرنے کے بعد بھی نہ بجھ سکی-

ooooooooooo

گاؤں والوں کو جمعدار رفیق خان اور جمعدار جمیل خان کی صورت میں ایک نئی مصروفیت مل گئی تھی۔ گاؤں کے چوپال میں ان کی آمد کے سب منتظر رہتے تھے -ان سے جنگ کے واقعات سننا سب کو پسند تھا۔ جب رفیق اور جمیل انہیں جنگلوں میں موجود حشرات الارض، بڑے سائز کی مکڑیوں، عجیب و غریب نسل کے جانوروں کے قصے سناتے تو وہ حیران رہ جاتے۔ شیدے اور شیر والا قصہ انہیں ڈرا دیتا- جلے ہوئے مکان اور گلی سڑی پرانی لاشوں کا سن کر وہ بچارے دہشت زدہ ہو جاتے تھے۔

ہندوستان میں آزادی کی تحریک دن بدن تیز ہو رہی تھی- کہ ۱۹۴۵ شروع ہو گیا۔

اسی آزادی کی خاطر ہندوستانیوں نے جنگ عظیم دوئم میں لاکھوں کی تعداد میں جان کے نذرانے پیش کیے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریز حکمرانوں نے جبری بھرتی کے تحت ہندوستانیوں کو لڑنے بھجا تھا-جب کہ دوسری جنگ عظیم میں عوام کے پیش نظر ہندوستان کی آزادی تھی۔ انگریزوں نے جنگ میں شمولیت کی حوصلہ افزائی کی تھی اور آزادی کا لالچ دیا تھا لیکن مکار انگریز کے وعدے پر بہت سارے ہندوستانیوں کو یقین نہیں تھا۔ جنہیں یقین تھا وہ انگریز فوج کے ساتھ آزادی کے لیے لڑے۔

اور جن کو یقین نہیں تھا انہوں نے الگ تحریک کا اعلان کر دیا۔

برصغیر کو انگریزوں سے آزاد کروانے کے لیے جتنی بھی تحریکیں چلائے گئی تھیں ان میں سے ایک مشہور تحریک 'آزاد ہند فوج' یا انڈین نیشنل آرمی تھی جس کی قیادت "سبھاش چندر بوس" کے ہاتھوں میں تھی۔

وہ ہندوستانی جو جاپانیوں کی قید میں چلے گئے انہوں نے جاپانیوں کے ساتھ مل کر " آزاد ہند فوج "بنالی کیونکہ جاپانیوں نے ان سے فتح کی صورت میں آزادی کا وعدہ کیا تھا۔' آزاد فوج کا نصب العین آزادی تھا۔ جس میں جاپانی ان کی مدد کر رہے تھے ۔ ان کے مطابق جنگ کرنا ہر ہندوستانی کا فرض تھا تاکہ برطانوی راج سے چھٹکارہ حاصل کیا جاسکے۔

اس تحریک کا آغاز "سبھاش چندر بوس" نے رنگون سے بہادر شاہ ظفر کے مرقد سے کیا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ تحریک ہندوستان کی آزادی تک جاری رہے گی ۔ آزادی کے بعد بادشاہ کا مقبرہ ہندوستان میں تعمیر کیا جائے گا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی لاش رنگون سے لے جاکر اس مقبرے میں منتقل کی جائے گی۔

اس تحریک نے فوج کی شکل میں کامیابیاں حاصل کی۔ ہندوستانیوں نے آزادی کے لیے مالی مدد کی۔ عورتوں نے زیور دیے۔ مردوں نے مال دیا ہندوستان کے تحریک کے حامی نوابوں نے قیمتی نوادرات دیے لیکن اس فوج میں شامل ہندوستانی کثیر تعداد میں جنگ میں بیماری، لڑائی اور بھوک کے ہاتھوں مرے۔

پہلے پہل تو جاپانی ہندوستانی آزاد ہند فوج کی کامیابیوں سے خوش ہوئے پھر دانستہ ان کو دشوار گزار محاذ دے دیے گئے۔ راشن کی سپلائی بھی کم کر دی گئی تھی۔

ایک وقت ان پر ایسا بھی آیا کہ انہیں مردہ جانوروں کا گوشت کھانا پڑا۔

انہوں نے برٹش فوج کو بہت نقصان بھی پہنچایا اور انگریزوں پر اپنی دھاک بھی بٹھائی۔

تحریک اپنے زوروں پر تھی کہ اس تحریک کے بانی سبھاش چندر بوس طیارے کے حادثے میں ۱۹۴۵ میں انتقال کر گئے۔

سبھاش چندر بوس کا نعرہ تھا "تم مجھے خون دو میں تمہیں آزادی دونگا"۔

آزادی کے متوالوں نے خون دیا اور مال بھی دیا۔

دوسری جنگ عظیم میں پچیس لاکھ سے زیادہ ہندوستانی فوجیوں نے حصہ لیا۔ ان میں سے چھتیس ہزار ہندوستانی ہلاک یا لاپتہ اور چونسٹھ ہزار تین سو چوّن زخمی ہوئے۔ چار ہزار ہندوستانیوں کو بہادری کے اعزازات ملے ۔ اس جنگ میں اسّی ہزار ہندوستانی جنگی قیدی بنے۔

جنگ میں حصہ لینے والے ہندوستانی فوجیوں کے اخراجات بھی ہندوستان کو اٹھانا پڑے تھے - جس کا بوجھ ٹیکسوں کے ذریعے وہاں کے عام آدمی پر پڑا۔

اس جنگ میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے مسلمان اور سکھ شامل تھے۔ اس کے علاوہ پٹھانوں، راجپوتوں اور گورکھوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔

جنگ کے اخراجات کے لیے عوام خصوصا بنگالیوں پر بہت ٹیکس لگایا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں بنگال کا قحط دس لاکھ سے زیادہ بنگالیوں کو نگل گیا تھا- اس قحط کی آڑ میں انگریز افسروں نے بہت مال بنایا۔

"ہیروئی اونوڈا" نام کا ایک جاپانی سپاہی دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد بھی جنگل میں چھپا رہا اور بیس پچیس سال تک یہ سمجھتا رہا کہ جنگ ابھی جاری ہے۔

ہمیشہ سے جنگ میں بے گناہ افراد نشانہ بنتے ہیں۔

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں گوراراج کے خلاف تحریکیں شروع ہو چکی تھی - جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ "ہندوستان چھوڑ دو"

سول نافرمانی اور

انڈین نیشنل آرمی برطانوی سامراج کے خلاف تھے -جواب کھل کر سامنے آ گئے۔

جنگ کے بعد برطانیہ بھی مالی طور پر بہت کمزور ہو چکا تھا اور اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہندوستان پر مزید قابض رہ سکے -لیکن مکار انگریز کس صورت میں بھی امن و امان والا ہندوستان چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا

جنگ کے بعد دونوں بھائی رفیق اور جمیل والد کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے لگے۔

ooooooooo

چوتھا باب

بٹوارہ

کے آغاز سے ہی حالات خراب ہونے لگے۔ سیاسی گہمی عروج پر پہنچ گئی۔ ہندو بٹوارہ نہیں چاہتے تھے اور جناح صاحب یعنی مسلم لیگی الگ ملک پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ تاج برطانیہ نے ماؤنٹ بیٹن کو تقسیم ہندوستان کے لیے ہندوستان بھیجا تھا- ان حالات میں جولائی کا مہینہ شروع ہو گیا۔ ساندل بار کا علاقہ اور اس سے متصل گنجی بار، نیلی بار کے علاقے پاکستان کے حصے میں آ گئے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواحی دیہات میں مقیم ہندو اور سکھ اپنا سامان باندھنے لگے اور ہجرت کرنے لگے۔

جگجیت سنگھ ایک دن پریشان سا گھر میں داخل ہوا اور دلجیت سے کہنے لگا "اپنا سامان باندھ لے - تین چار دن میں نکلنا ہے ہندوستان جانے کے لیے۔

میں نے دکان بیچ دی ہے - پرسوں پیسے مل جائیں گے۔ نکل چلیں گے "

"ہم کیسے جائیں گے سردارا سوچ ذرا"۔

"ہم کون سا اکیلے جائیں گے پنڈ کے پچاس بندے ساتھ ہیں - ریل گاڑی کی ٹکٹیں بک کروانی ہیں شام کو - تو بس تیاری رکھ - اس سے پہلے کہ حالات خراب ہو جائیں - نکل چلتے ہیں"۔

جگجیت سنگھ نے جانے کی منصوبہ بندی بتائی-

"اچھا جیسے تو کہتا ہے"

دلجیت بولی

تیسرے دن وہ گھڑیاں سنبھالے اسٹیشن کو روانہ ہو گئے - جن کے پاس مال مویشی تھے - انہوں نے بیچ دیے۔ فصلیں جو پک گئی تھی اونے پونے داموں فروخت کی۔ جو فصلیں تیار نہیں تھی - ان پر کلمہ افسوس پڑھا اور الوداعی نظر اپنے پنڈ پر ڈالی - ہائے یہ دن بھی آنا تھا۔

اسٹیشن تک ڈھائی میل لمبا رستہ تھا - بچے اور گھڑیاں اٹھائی ہوئی عورتیں، بوریاں سروں پر رکھے لمبی داڑھیوں اور پگڑیوں والے مرد باتیں کرتے جا رہے تھے۔

عورتیں بہت غم زدہ تھیں۔

"ہائے سورگ نالو سوہنا پنڈ سی ساڈا"

(ہائے جنت سے خوبصورت گاؤں تھا ہمارا)

ایک بولی

"میں تاں ویاہ کے آئی ساں۔ سوہریاں داویڑہ چھٹ گیا"

(میں تو بیاہ کے آئی تھی سسرال کا صحن چھوٹ گیا)

کچھ عورتیں رو رہی تھیں۔ دلجیت کور خاموش تھی۔

سب اسٹیشن پر بیٹھ کر ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

عورتوں کی آہ و بکا جاری تھی۔

ایک بڈھا سکھ سردار عورتوں سے مخاطب ہوا

"بیبیوں حوصلہ کرو تسی تاں حوصلہ ہی چھڈ تاں۔ اساں پنجاب ہی چلے آں۔ اتھے وی آپاں پنجاب وچ ہی رہناں آں۔ آپاں کیہڑاں افغانستان چلے آں جو تسی ایناں پھڑ تول پایاں ہویاں آں"

(آپ حوصلہ کریں آپ نے تو ہمت ہی چھوڑ دی ہے ہم پنجاب ہی جا رہے ہیں

وہاں بھی ہم نے پنجاب میں ہی رہنا ہے

ہم کونسا افغانسان جا رہے ہیں جو آپ نے اتنا شور مچایا ہوا ہے)

ایک عورت جو خود کو سیانا سمجھتی تھی بولی

"پنجاب چے ہی رہنا آں تے اپنا پنڈ کیوں چھڈیے آپاں۔ ایتھے ہی ناں رہیے"

(پنجاب میں ہی رہنا ہے تو اپنا گاؤں کیوں چھوڑ کے جا رہے ہیں یہاں ہی رہتے ہیں)

"بہن میرے ایہ گل توں لیڈراں نوں پچھ جنہاں ونڈاں پائیاں آں"

(میری بہن یہ بات آپ لیڈروں سے پوچھیں جنہوں نے تقسیم کی ہے)

سردار نے عورت کی بات کا جواب دیا۔ اس مکالمے کے بعد خاموشی چھا گئی۔

ریل گاڑی آئی اور وہ سب سوار ہو گئے۔

عورتیں حسرت بھری نگاہ سے ریل کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی - مردوں کو امید تھی کہ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو وہ دوبارہ اپنے گاؤں میں آکر آباد ہو جائیں گے -ملک بھی کبھی تقسیم ہوئے ہیں بھلا -
یہ تو فرنگیوں کی چال ہے
وہ چلے جائیں گے پھر ہندوستانیوں کی مرضی چلے گی۔

ooooooooooo

عظیم خان کا ننھیال ہوشیار پور شہر میں آباد تھا -اس کا سالا اکبر خان شروانی ریلوے میں ملازم تھا -اس کی ڈیوٹی فیصل آباد کے ریلوے اسٹیشن پر تھی -وہ وہاں کا اسٹیشن ماسٹر تھا اس نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا اور چھٹی لے کر ریل گاڑی سے ہوشیار پور پہنچا- یہ اگست ۱۹۴۷ کا زمانہ تھا اس نے گھر والوں سے ضروری سامان باندھنے کا کہا- گھر والے جن میں اس کے والدین بیوی، جوان بچے اور دو بھائیوں کے خاندان تھے ۔انہوں نے کپڑے، برتن، لحاف، گدے کھیس، چادریں،، تصویریں، کتابیں اور آرائشی سامان بڑے بڑے لکڑی کے صندوقوں میں پیک کر لیا۔

اکبر خان شروانی نے سامان بلٹی کروادیا۔

انہوں نے گھر میں فرنیچر، جستی پیٹیاں اور بھاری سامان چھوڑا اور فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گئے -ریل گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے اس نے اپنے سالے عظیم خان برکی کو تار دیا کہ ہم پاکستان جا رہے ہیں تم لوگ بھی نکلنے کی تیاری کرو حالات خراب ہو رہے ہیں۔

"

وہ اہل خانہ جو کہ پچیس افراد پر مشتمل تھے ریل گاڑی کے ذریعے خیر خیریت سے فیصل آباد پہنچ گئے -

وہاں انہیں ریلوے کے کوارٹر میں رہنا پڑا -جو اکبر خان شروانی کی والدہ محمد بی بی کی والدہ اور رفیق خان کی نانی قدسیہ بیگم کو بہت ناپسند آیا۔

"ہوشیار پور میں ہماری پکی حویلی تھی - تین منزلہ۔ کیا شان و شوکت تھی ہائے ہائے کہاں آگئے ہیں -اس ڈربے میں غضب خدا کا پچیس جنے (افراد)
اور یہ چند کمرے

کیسے گزارہ ہو گا

وہ شکوہ کناں رہتی "۔

"امی جی سب ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں یہاں بھی پکا کشادہ مکان ملے گا آپ بس ہمت سے کام لیں"۔

اکبر خان ماں کو تسلی دیتا۔

عظیم خان کو تار ملا تو وہ سوچ میں پڑ گیا

اس نے برادری مشورہ کیا لیکن سب کا یہ ہی خیال تھا کہ کچھ نہیں ہو گا وہ بھی پنجاب کے علاقوں کے رہنے والے مسلمانوں کی طرح آرام سے بیٹھے رہے - کیونکہ پنجاب مکمل طور پر پاکستان کے حصے میں شامل ہونے کی اطلاع تھی - پھر تقسیم ہندوستان میں یہ علاقے بھارت کو دے دیے گئے اور یکدم شور مچ گیا کہ نکل جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے - کسانوں کی کپاس کی فصل تیار کھڑی تھی - پنجاب کے حالات بہت خراب ہو گئے مسلمانوں کو اپنی جان کی پڑ گئی۔

جالندھر شہر میں مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔ جالندھر کے ارد گرد پانچ میل کے فاصلے پر پٹھانوں کی بارہ بستیاں آباد تھیں۔

یہ بستیاں ۱۶۰۰ میں آباد ہوئی تھی - ان میں سے تین بستیاں تو سکھوں نے لڑائی کے بعد آگ لگا کر جلا دی تھیں - باقی نو بستیاں آباد تھی۔ جالندھر کے گاؤں دھوگڑی میں پٹھان بڑی تعداد میں آباد تھے - جو نہی حالات خراب ہوئے۔ ان پٹھانوں کے ساتھ ساتھ دوسری ذاتوں کے مسلمان جاٹ، گوجر، ارائیں اور دیگر کو بھی جان کے خوف سے بے سرو سامانی کے عالم میں نکلنا پڑا۔

****

پانچواں باب

ہجرت

عظیم خان برکی کے خاندان نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ انہیں ہندو اور سکھوں سے جان کا خطرہ تھا۔ وہ سمجھے کہ جالندھر پاکستان میں شامل ہو گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ جلدی میں سامان / جانور بھی ساتھ نہ لے جا سکے ۔ سکھوں کے حملے کے خوف سے رات کی تاریکی میں سارا خاندان جو تیس افراد پر مشتمل تھا- وہ جالندھر نکودر سے نکلا پھر ان کے ساتھ حسنہ کا مائیکہ خاندان جو نورپور گاؤں میں آباد تھا- ان کے چالیس افراد بھی قافلے سے آملے۔ خاموشی سے سب چل رہے تھے - حسنہ کو اپنا جہیز یاد آ رہا تھا- کتنی محنت سے اس نے سفید پوش پر کڑھائی کی تھی۔ سفید چادریں پھول بوٹوں سے کڑھائی کر کے بنائی تھی۔ سوئیٹر بُنے تھے۔ کھیس بُنے تھے۔ رضائیاں سی تھی۔ جہیز ابھی تو استعمال بھی نہیں کیا تھا کہ چھوڑنا پڑا- شاید میری قسمت میں یہ ہی لکھا تھا۔ حسنہ نے سوچا- رفیق کو بیلوں کی جوڑی یاد آ رہی تھی- جو وہ ہل میں جوتتا تھا- عظیم خان کو باپ دادا کی قبروں سے جدائی کا غم لگا ہوا تھا۔ وہ نماز فجر کے بعد قبروں پر بلاناغہ فاتحہ پڑھنے جاتا تھا- اور پانی چھڑکتا تھا۔

محمد بی بی کو اپنی گائے اور بھینسیں یاد آ رہی تھی۔

جمیل کو یار دوستوں سے بچھڑنے کا غم ستا رہا تھا۔ عظیم خان برکی کی والدہ ساتھ تھی- اسے اپنے گھر، اپنی زمینوں کا دکھ تھا۔ بچاری پردہ دار عورت تھی۔ کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا- اس کا گھر ہی اس کی کل کائنات تھا۔

سب اپنے اپنے غموں کا بوجھ اٹھائے خاموشی سے چل رہے تھے کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں آنے لگی۔

"سب فوراً درختوں میں جا کر چھپ جاؤ- جلدی کرو"

قافلے میں سے کوئی چیخا۔

وہ سب درختوں کے جھنڈ میں چلے گئے درختوں کی تعداد زیادہ تھی وہ سب چھپ گئے۔

آنے والے سوار سکھ تھے ہاتھوں میں کرپانیں اور سر پر خون سوار تھا-

وہ انکے گاؤں کی طرف ہی جا رہے تھے۔

"شکر ہے مولا وقت سے نکل آئے۔"

قافلہ پھر چلنے لگا صبح ہو گئی سورج نکل آیا سب کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی اگست کا مہینہ تھا موسم گرم اور حبس زدہ تھا۔

عظیم خان کا قافلہ مقررہ جگہ تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک مائی تنور پر روٹیاں لگا رہی تھی اس نے دال کی دیگ پکا رکھی تھی۔ وہ ہر مسافر کو دو روٹیاں اور دال کا سالن دیتی۔ انہیں بھی کھانا دیا گیا۔ عظیم خان نے جن ہاتھوں سے وہ روٹی پکڑی۔ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس کے پٹھانی خون نے کیسے یہ گوارا کیا۔ دینے والے ہاتھ آج لینے والے بن گئے۔

اتنے میں انتظامیہ کے آدمی آ گئے - ان لوگوں نے قافلے والوں کی گنتی کی - کل تعداد ۷۵ تھی پھر انہوں نے قافلے والوں سے خطاب کیا۔ ان کے ساتھ ایک آدمی تھا جس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔

"یہ ارشاد علی ہے تم سب کا گائیڈ ہے اس کی تم نے پیروی کرنی ہے ورنہ مارے جاؤ گے جس راستے پر یہ لے جائے اس پر چلنا اس کی بات ماننا۔"

یہ کہہ کر انتظامیہ کے بندے چلے گئے

ارشاد علی نے ان سے کہا

"میری بات ماننا اور مجھے تنگ مت کرنا اب

چلو"۔

وہ سب ارشاد علی کے اتباع میں چل پڑے -

بیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک کنواں نظر آیا۔

پیاس کی شدت سے سب کا برا حال تھا۔ شدید گرمی سے حلق سوکھے ہوئے تھے -

ننھا کبیر تین سال سات ماہ کا تھا۔ اسے اس کے باپ رفیق خان نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ حسنہ دوبارہ امید سے تھی۔ اس کا چوتھا مہینہ چل رہا تھا- حسنہ کی ماں کو اپنے مائیکے کا غم لگا ہوا تھا- حسنہ کا ننھیال فیض اللہ گاؤں ضلع گورداسپور میں آباد تھا۔ ان کی کوئی خبر نہیں تھی- ان سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا- وہ ایسی افراتفری میں شہر سے نکلے کہ ان کی خبر لینے کوئی نہیں جا سکا۔

دوسری طرف اسے حسنہ کی فکر تھی- حسنہ کی طبعیت خراب تھی وہ پہلے سے ہی نڈھال تھی اس پر ایسا سفر درپیش آ گیا تھا۔

سب قسمت کے لکھے کو بھگت رہے تھے۔

ارشاد علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔" کنویں کے قریب مت جانا۔"

دو من چلے نوجوانوں نے اس کی بات نہیں سنی اور کنویں کا رخ کیا۔ کنویں کے اندر جھانکتے ہی ان کی چیخیں نکل گئی۔ کنویں میں عورتوں کی لاشیں تھیں۔

ان عورتوں نے آبروریزی کے خوف سے کنویں میں چھلانگیں لگادی تھی۔

"تمھیں منع کیا تھا میں نے"۔

"آسمان پر گدھ چیلیں اور کوے اڑ رہے ہیں مطلب لاشیں ہیں یہاں"

افسردہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ چند فرلانگ چلے تھے کہ ایک عورت کی برہنہ لاش زمین پر پڑی دکھائی دی۔ شرم سے سب کی آنکھیں جھک گئی۔ پاس دو بچے بھی مردہ پڑے تھے۔ قریب ہی ایک مرد کی لاش پڑی تھی۔ جس کے سینے میں کرپان گڑی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گئے یہ بچارے مسلمان ہیں۔ ایک بزرگ آدمی نے کندھے سے صافہ اتارا اور عورت کی ستر پوشی کر دی۔

"ہم پہلے ان مُردوں کی تدفین کریں گے پھر آگے چلیں گے۔"

ایک آدمی بولا

"تدفین کا وقت نہیں ہے"

ارشاد علی نے کہا" سکھ کسی وقت بھی دھاوا بول سکتے ہیں"

قافلہ میں سے ایک بابا بولا

"ہم اپنے مسلمان مُردوں کی لاشوں کو ایسے نہیں چھوڑ سکتے بے حرمتی ہو گی"

"ٹھیک ہے ان کو بھی اٹھا کر کنویں میں ڈال دو۔ تم لوگوں نے پشاور ایکسپریس میں ہوئی قتل و غارت گری نہیں دیکھی۔ دیکھ لیتے تو سمجھ جاتے کہ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کے سر پر شیطان سوار ہے تم لوگ جان لیتے اسی دن کے لیے فرشتوں نے کہا تھا

انسان زمین میں خوب بہائے گا اور فساد کرے گا اب چلو"

لاشیں کنویں میں ڈال کر وہ پھر چل پڑے ۔شام ڈھل رہی تھی ۔مغرب ہونے والی تھی۔رات گزارنے کے لیے انہیں محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔

ooooooooooo

جگجیت سنگھ ڈبہ والا گاؤں سے ریل گاڑی کے ذریعے کیمپ پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنے گرائیوں (گاؤں والے) کے ساتھ کیمپ میں رہائش پذیر تھا۔ ان کو جالندھر اور لدھیانہ گورداسپور اور امرتسر کے دیہاتوں میں آباد کیا جانا تھا۔ ہندوستانی پنجاب کے گاؤں تیزی سے خالی ہورہے تھے۔ یہ اپنی باری کے انتظار میں تھے ۔عورتوں کا مشغلہ یہاں بھی رونا دھونا، واویلا مچانا اور قصے سننا سنانا تھا۔ مرد آنے والے وقت کی جمع تفریق کرتے رہتے۔ انہیں واہے گُرو سے امید تھی کہ زرخیز زمینیں ان کے حصے آئے گی ۔وہ بٹوارہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

دس دن بعد جب ہندوستانی پنجاب مکمل طور پر خالی ہو گیا تو ان کسانوں کو الاٹمنٹ شروع ہو گئی۔ کلیم ان لوگوں نے آتے ہی جمع کروا دیے تھے۔

جس جس کی باری آتی۔ وہ الاٹ شدہ علاقے میں چلا جاتا ۔سب ایک دوسرے کو نام پتے دیتے جاتے کہ دوبارہ ملاقات ہو سکے ۔جگجیت سنگھ کو بھی مکان مل گیا اور دکان بھی۔

اسے کپور تھلہ کے علاقے میں مکان اور دکان ملی تھی۔اس کا یہ مکان کشادہ تھا اور دکان بھی اچھے علاقے میں تھی ۔وہ بہت خوش تھا ۔بٹوارہ اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔اس کی دکاندار ذہنیت تھی۔اسے بے گناہ انسانوں کے قتل وغارت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنا الو سیدھا رکھتے ہیں۔

oooooooooooo

عظیم خان کے قافلے کو ایک خالی گاؤں مل گیا۔ گاؤں کے مکین پاکستان جا چکے تھے۔

ارشاد علی نے عورتوں کی ڈیوٹی کھانا پکانے پر لگائی اور مردوں کے ذمے ہاتھ والے نلکے سے پانی بھرنے کا کام لگایا۔ سب مرد باری باری نہائے ۔صافے باندھ کر دھوتیاں دھو کر سکھا کر دوبارہ باندھ لی۔

عورتوں نے کھانا بنالیا۔ سب نے کھانا کھایا۔ پھر رات کا اندھیرا پھیل گیا تو عورتیں بھی نہا دھو کر نماز پڑھنے لگی۔ عورتوں کی گٹھڑیوں میں دو جوڑے کپڑے، جائیداد کے کاغذات، سونا اور روپے تھے - عورتوں نے بھی کپڑے دھو کر ڈال دیے۔ سب سو گئے - انہوں نے احتیاطاً مکمل اندھیرا کر رکھا تھا۔

صبح نماز پڑھ کر عورتوں نے کھانا بنایا۔ ارشاد علی نے اضافی روٹیاں پکوا کر اچار کے ساتھ بندھوالی۔ انہی گھروں سے انہیں اچار کے کنستر بھی مل گئے۔ آٹے کے بوریاں اور خشک راشن انہوں نے ایک ٹوٹے ہوئے گڈے (بیل گاڑی) کو مرمت کر کے اس پر باندھ لیا اور پانی کے گھڑے بھی رکھ لیے - انہیں ایک گدھا بھی مل گیا- جو گڈا کھینچنے لگا- وہ روانہ ہو گئے - ان کی اگلی منزل "ترن تارن صاحب" تھا۔

چلتے چلتے ریلوے پھاٹک آ گیا- اب وہ ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

ارشاد علی نے ان کو ایک تنبیہہ کی تھی کہ جونہی ٹرین کی آواز سنائی دے - وہ سب کھیتوں میں چھپ جائیں۔ اگر ٹرین میں ہندو سکھ زندہ ہوئے تو وہ زنجیر کھینچ کر ٹرین روک لیں گے اور سب مارے جائیں گے -

اس اطلاع نے ان میں مزید خوف پیدا کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگ -ے راستہ جلدی ختم ہو جائے - ان کی خوش قسمتی تھی کہ بخیر و عافیت "ترن تارن صاحب" پہنچ گئے - انہوں نے ساتھ لایا کھانا کھایا۔ نماز ادا کی اور درختوں کی چھاؤں تلے ستانے لگے۔

ایک گھنٹے بعد ان کا سفر دوبارہ شروع ہونے والا تھا۔

سورج سوا نیزے پر تھا۔ گرمی نے برا حال کر رکھا تھا۔

انہیں اجنالہ پہنچنا تھا۔ وہ پھر چلنے لگے - دس میل آگے گئے تو ہندوؤں کا گاؤں آ گیا- اس گاؤں پر مسلمانوں نے حملہ کیا تھا- ہندو مرد عورتوں کی لاشیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھی - عورتیں سب ساڑھیوں میں ملبوس تھی۔ ماتھے پر سندور اور بندیا لگی ہوئی تھی - پکے رنگ کی یہ پتلی دبلی عورتیں، ننگ دھڑنگ بچے اور انکے مرد سب مر چکے تھے۔ گاؤں قبرستان بن چکا تھا۔

ہندوؤں کو بٹوارہ منظور نہیں تھا- دوسری طرف مسلمانوں کی حالت بہت کمزور تھی - جناح صاحب کو ڈر تھا کہ ہندو مسلمانوں کو غلام بنالیں گے - اسی لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا- سکھوں کو ننکانہ صاحب کے پاکستانی میں شامل ہونے کا غصہ تھا- جذباتی ہندوستانی عوام اپنے ہی ہم وطنوں کو بے دردی سے کاٹ رہی تھی -مار رہی تھی۔

اور مرنے والے بے گناہ عام شہری تھے -وہ عام شہری جنہیں پہلے راجا اور نوابوں نے غلام بنا رکھا تھا-ان کے بعد انگریزوں نے غلام بنایا اور اب انہیں جمہوری تماشا انگلیوں پر نچانے والا تھا-

پنجاب کے درمیان لکیر کھینچنے والے پنجابی نہیں تھے -بدیشی تھے۔

مگر اپنے ہم وطنوں کو خون میں نہلانے والے تو ہندوستانی تھے۔جو کئی سو برسوں سے اکھٹے ہندوستان کی سرزمین پر رہ رہے تھے۔یکدم ان کو کیا ہوا؟

قافلے والے انسانیت کی یہ تذلیل دیکھ کر بہت ملول ہوئے لیکن وہ بچارے کیا کر سکتے تھے -

"جلدی چلو"

ارشاد علی نے باآواز بلند صدا لگائی-

وہ سب تیز تیز چلنے لگے -

"اجنالہ زیادہ دور نہیں ہے جلدی کرو"-

ارشاد علی نے ان سے کہا

اجنالہ جہاں شہیدوں کا کنواں تھا- جو ان ہندوستانی سپاہیوں کی لاشوں کی باقیات سے بھرا یہ کنواں انگریزوں کی دین تھی -یہ ان شہیدوں کی آخری آرام گاہ تھی -جو ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بھی ہندوستان کو آزادی نہ دلا سکے -

ہندوستانی فوج کی چھبیسویں (۲۶) مقامی بنگال انڈین ریفنٹری رجمنٹ کے ان سپاہیوں پر پہلے تشدد کیا گیا تھا۔ پھر ان کو گولیاں ماری گئی - اس کے بعد ان کی لاشوں سے کنواں بھر دیا گیا- دوران جنگ (۱۸۵۷ کی جنگ آزادی) برطانوی افسران کو قتل کرنے کے بعد یہ فوجی فرار ہوئے تھے - مگر مخبری پر پکڑے گئے ۔۲۸۲ ہندوستانی فوجیوں کو شہید کر دیا گیا۔اس کنویں کا نام "شہیداں والا کھوں "(کنواں) پڑ گیا۔

وہ اجنالہ کے گاؤں میں موجود اس شہیداں والے کھوں پر پہنچے تو کنویں سے شدید تعفن اٹھ رہا تھا۔

کنواں مسلمانوں کی لاشوں سے بھرا ہوا تھا- کنویں کے منہ پر لاشوں کا انبار تھا- ایسا لگ رہا تھا کئی سو انسانوں کی لاشیں ہیں۔ لیکن اس دفعہ مارنے والے دشمن دیار غیر سے نہیں آئے تھے -یہ تو اپنے ہم وطن تھے -ہمسائے تھے -سنگی بیلی تھے -ان کے ساتھ بچپن گزرا تھا-ان کے سنگ جوانی کے گیت گائے تھے۔

یہ وہی امر تسر تھا- جس کے جلیانوالہ باغ میں مسلمان، سکھ اور ہندوؤں نے سینے پر گولیاں کھائی تھیں۔ عورتوں نے بھی مردوں کے شانہ بشانہ جان کے نذرانے پیش کیے تھے -اسی آزادی کی پاداش میں جو ملی۔ تو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے ۔ جن بچیوں کو گود میں کھلایا تھا۔ جن عورتوں کو ماں اور بہن کہا تھا وہ ان کے لیے اب محض عورتیں بن گئی تھیں ۔ دشمن کی عورتیں۔ آبروریزی اور بے حرمتی کرنے کے لیے ان کا استعمال کیا گیا- جن معصوم بچوں کے گال چومے تھے -ان کے سروں کو نیزوں میں پرو دیا گیا۔

کہاں گیا ہندوستانیوں کا بھائی چارہ۔

کیا ہوا؟

یہ اچانک دشمن کیسے بن گئے ؟"

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا- "

وہ روتے ہوئے وہاں سے نکلے -مغرب ہو چکی تھی -رات گزارنے کے لیے انہیں ٹھکانہ چاہیے تھا- ارشاد علی نے ان سے کہا تم لوگ یہاں بیٹھو- میں کوئی بندوبست کرتا ہوں-

پندرہ منٹ بعد ارشاد علی واپس لوٹا اور ان سے کہا

"چلو میرے ساتھ"

ارشاد علی انہیں ایک اسکول میں لے آیا اسکول کی عمارت ویران تھی۔ یہ اسکول گاؤں سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ اسکول سے ملحقہ قبرستان تھا۔ قبرستان میں بڑی تعداد میں قبریں بنی ہوئی تھی کچھ قبریں چند دن پرانی تھی۔

دو کمرے مردوں کو اور دو عورتوں کو دے دیے گئے۔ اسکول کے احاطے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے ان عورتوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ وضو کیا۔ سفر کی گرد دور کی۔ مرد حضرات نہائے -انہوں نے کھانا کھایا۔

آج تو عورتوں کی باتیں بھی ختم ہو گئی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی -راستے کے مناظر آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے -حسنہ بے دم سی ماں کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی۔

ارشاد علی نے لڑکوں کی ڈیوٹی اسکول کے گیٹ پر لگادی -اسکول کچا تھا- گیٹ بھی کچا تھا- بڑے بڑے چوڑے استون تھے جن کے پیچھے دو دو لڑکے بیٹھ گئے ۔ گاؤں چونکہ ہندوؤں اور سکھوں کا تھا۔ اس لیے انہیں جان کا خوف تھا۔

لڑکے باری باری گیٹ پر چوکیداری کرتے رہے۔

رات کے دو بجے ارشاد علی نے سب کو جگا دیا۔

"جلدی اٹھو اور چلو۔ اس پہلے کہ گاؤں والے جاگ جائیں اور کھیتوں کو رخ کریں-سب یہاں سے نکل چلو۔ منہ ہاتھ دھونے کا وقت نہیں ہے۔ جلدی نکلو۔"

وہ بچارے افراتفری میں وہاں سے نکلے-کھانا رات ہی ختم ہو چکا تھا-اب تو بس بھوک تھی-پیاس تھی-پیادہ سفر تھا۔ وہ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد گاؤں کی حدود سے دور نکل آئے۔ انہیں چلتے چلتے فجر ہو گئی-"کہیں پانی مل جائے تو نماز پڑھ لیں"

ایک بزرگ نے ارشاد علی سے کہا۔

جس کچی سڑک پر وہ چل رہے تھے-اس میں پانی کی کمی کے باعث دراڑیں پڑی ہوئی تھی-ایسا لگ رہا تھا کہ کسی انسان کے پیاسے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیاں ہیں۔

"دعا کر بابا"-ارشاد علی بولا

چلتے چلتے تین کوس کے بعد انہیں ایک نہر آگئی-سب نہر کے پانی سے وضو کرنے لگے اور پیاس بجھانے لگے۔

نہر کے ساتھ ہی نیچے ایک میدان نما کھیت تھا۔ جس کی فصل کٹ چکی تھی اور وہ اب خالی تھا-انہوں نے وہاں باجماعت نماز ادا کی اور پھر چل پڑے۔

راستے میں آموں کے درخت تھے-جو کہ آموں سے خالی تھے۔ کھیتوں میں لگی ہوئی کچی سبزیاں کھانے کے قابل نہیں تھی۔ کریلے، ٹینڈے، کدو وہ کچے نہیں کھا سکتے تھے

-سردیوں کا موسم ہوتا تو ان کھیتوں میں مٹر، گنے، گاجر مولی لگے ہوتے جو وہ کھا لیتے-لیکن ایسا نہیں تھا۔

-چلتے چلتے گیارہ بج گئے اب تو بھوک نڈھال کرنے لگی تھی کہ ان کی نظر ایک مسجد پر پڑی-مسجد کے ساتھ کنواں تھا-وہ کنویں کے ڈول سے پانی بھر کے پیاس بجھانے لگے-اتنے میں امام مسجد مسجد سے نکل کر ان کی طرف آیا-اور انہیں گھر چلنے کی دعوت دی کھانے کا بھی کہا

-وہ اس کے ساتھ چل پڑے وہ ان لوگوں کو لے کر ایک بہت بڑی حویلی کے دیو ہیکل دروازے پر پہنچا

-۔وہ سب حیران تھے

اندر داخل ہوئے تو ایک دیوڑھی سے گزر کر وہ ایک ہال کمرے میں داخل ہوئے - اس کمرے میں فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر اور چھت پر میناکاری کی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ منجیاں (چارپائیاں) بچھی ہوئی تھی - کھانا تیار تھا ان کے لیے دستر خوان بچھا دیا گیا - وہ سب کھانا کھانے لگے۔ دیسی مرغی اور آلو کا شوربہ تھا۔ ساتھ تنور کی روٹیاں تھیں - وہ تقریباً تین سو افراد تھے - کھانا انہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا - اس کے بات دودھ پتی پی۔

- کھانے کے بعد امام مسجد نے انہیں بتایا۔

"یہ حویلی چوہدری اللہ وسایا لنگڑیال کی ہے۔ وہ اس گاؤں کے نمبر دار تھے۔ انہوں نے ہجرت کے وقت جاتے ہوئے اس حویلی کی چابیاں مجھے دی اور کہا صبح شام کھانا بنوانا۔ اور جب تک آخری پنجابی ہجرت نہ کر لے۔ تب تک یہاں رہنا - وہ جاتے ہوئے راشن برتن اور نوکر ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے

امام مسجد کہنے لگا۔" دیسی ککڑ (مرغے)، بکرے یہاں بندھے ہیں جی - اس حویلی کے پچھواڑے میں - پورے پچاس من گندم تہہ خانے میں رکھ کر گئے ہیں - چوہدری صاحب۔ بیس من اب تک لگ گئی ہے - تیس من باقی ہے۔

صبح دس بجے تک دیگ پک جاتی ہے اور روٹیاں بھی۔ جو قافلہ گزرتا ہے - وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا کر جاتا ہے - شام کو دوبارہ کھانا تیار کیا جاتا ہے - جو مغرب تک بن جاتا ہے - ہماری عورتیں اور کام والیاں مل کر کھانا پکاتی ہیں - آپ آج کا دن یہاں رہ لیں - رات گزار کر صبح سویرے بانگ (اذان) کے ساتھ نکل جائیں۔"

"نہیں چاچا تیرا بہت شکریہ۔ ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے - ہمیں جلد نکلنا ہو گا۔

چوہدری صاحب کا حلیہ بتادے - کیمپ جا کر شکریہ ادا کریں گے۔"

ارشاد علی نے امام مسجد کی بات کے جواب میں کہا

"ہمارے چوہدری صاحب اونچے لمبے، سانولے رنگ کے آدمی ہیں - بھرا بھرا جسم ہے - عمر ساٹھ سال ہو گی - ایک ٹانگ میں معمولی سا لنگ ہے - شکار کے بڑے شوقین ہیں - ایک دفعہ لت (ٹانگ) میں گولی لگ گئی تھی۔ اسی لیے لنگ آ گیا - زندہ دل اور ہنس مکھ ہیں - جہاں جاتے ہیں شغل لگاتے ہیں - ان کے قہقے بڑے جاندار ہیں۔ بہت

ودھیابندے ہیں جی۔ آپ ان سے ملنا تو میرا ابھی سلام کہنا اور بتانا کہ میں ان کے حکم کے عین مطابق عمل کر رہا ہوں۔"

امام مسجد نے تفصیلاً بات کی۔

انہوں نے جان کے خوف سے جلدی جلدی نکلنے کی کی۔ امام مسجد کا شکریہ ادا کیا اور واہگہ کی طرف چل پڑے۔

چلتے چلتے ان کو شام پڑ گئی۔

امام مسجد کے گھر کی عورتیں شام کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ کچھ نے آٹا گوندھا۔ دو پیاز، ٹماٹر کاٹنے لگی۔ امام مسجد کی بیوی نے سالن چڑھایا - اس کے ہاتھ میں خوب ذائقہ تھا۔ ایک دیگ وہ صبح پکاتی اور ایک شام کو پکتی - عصر کے بعد عورتوں نے تنور تاپ (گرم کر) لیا اور روٹیاں لگانی شروع کر دی - روٹیاں پکا کر وہ مہاجروں مسافروں کا انتظار کرنے لگی۔

ooooooooooo

چھٹاباب

لوٹ مار

سکھوں نے بٹوارہ میں لوٹ مار کا کام شروع کر لیا تھا- مسلح سکھوں کے جتھے گھوڑوں پر نکلتے اور شہروں کے بڑے بڑے مکانات لوٹتے۔ انہیں شہریوں سے طلائی زیورات، نوادرات اور قیمتی چیزیں مل جاتی- کتابیں تک نہ چھوڑتے۔ گھر لا کر کتابوں سے چولہے کی آگ جلاتے اور ایندھن کا کام لیتے۔

شہری نازک لڑکیاں بھی انہیں بہت پسند تھیں- ان لڑکیوں کو روند کر وہ قہقہے لگاتے۔

ایسا ہی ایک جتھہ زمینداروں کی حویلیاں لوٹنے پر بھی لگا ہوا تھا۔

اللہ وسایا لنگڑیال کی حویلی پر انہوں نے ہلہ بول دیا- دروازہ زور سے بجا تو امام مسجد نے دروازہ کھول دیا۔ وہ امام مسجد کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے

امام مسجد نے ان سے اونچی آواز میں کہا

"اجاڑے دا بہت غم آں"

(تقسیم کا بہت غم ہے)

یہ سن کر امام مسجد کا چھوٹا لڑکا زنان خانے کی طرف بھاگا-وہ اندر گیا اور عورتوں سے بولا

"آ گئے سکھ اماں سکھ آ گئے لُک جاوو چھپ جائیں

یہ سنتے ہی سب عورتیں بھاگ کر

گودام والے کمرے میں چلی گئی- انہوں نے بانس کی بنی سیڑھی اٹھائی اور تہہ خانے کا دروازہ کھول کے لگائی۔ وہ سب عورتیں جن کی تعداد تیرہ تھی- ایک ایک کر کے تہہ خانے میں اتر گئی۔ اندر اتر کر وہ بوریوں کے پیچھے چھپ گئی-

گھر میں مردوں کی کل تعداد سات تھی-پانچ چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے نیچے نظر رکھنے لگے-

لڑکے نے تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اوپر تُوڑی سے بھری ہوئی بوریاں رکھی اور خود کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں توڑی کی بوریاں، بالن (ایندھن) برتن آٹے کے کنستر اور پڑولا (گندم جمع کرنے والا بڑا اساراڈول نما جستی ڈرم) رکھے ہوئے تھے -ایک طرف کھیتی باڑی کے اوزار بھی پڑے ہوئے تھے۔

سکھ اندر آ گئے

"کھانا کو کچھ لے کے آ مولوی -بہت بھوک لگی ہے"-

مولوی نے گرما گرم کھانا ان کے سامنے رکھا-

وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے

"سواد آ گیا"

ایک سکھ بولا

"یہ کھانا کس نے پکایا گھر میں تو تیرے علاوہ کوئی نہیں دسا" (نظر آیا)

"یہ کھانا میں نے پکایا ہے" امام مسجد نے جواب دیا

"تُونے"

"تُو مولوی ہے یا نائی"-

سکھوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا-

"اس موئے پنڈ (مردہ گاؤں) میں کون کھاتا ہے ترا کھانا-اوئے کہیں تو جن تو نہیں ہے"

دوسرا سکھ بولا

"یہ مسلمان بھی ہے یا نئیں"

"چیک کر لے تو یار"

یہ سن کر سکھ قہقہے لگانے لگے-

ایک نے کہا

"کہیں تو آتما تو نہیں

سچی دَس" (بتاؤ)

ایک اور سکھ بولا

ان میں سے ایک سکھ شراب لے آیا- جو لوٹے ہوئے سامان میں تھی- وہ شراب پینے لگے۔

امام مسجد گندے برتن دھونے لگا-

وہ سب نشے کی حالت میں وہی لڑُک (لیٹ) گئے-

ادھر تہہ خانے میں عورتوں کا گرمی اور حبس سے برا حال تھا-

ان کی نیند جب گہری ہو گئی تو امام مسجد نے اپنے اہل خانہ کے لیے بچا ہوا کھانا لیا- کمرے میں جا کر ان کو تہہ خانے سے نکالا اور ان سب کو پیچھے بنے ایک کمرے میں اکھٹا کر کے کھانا کھلایا- پھر انہیں رات گزارنے کے لیے اپنے مکان میں

بھیج دیا- جو گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا-

امام مسجد کے مکان میں جا کر ان لوگوں نے فرش پر چھڑکاؤ کیا- چارپائیاں بچھائی۔ دو لڑکوں کو پہرے کے لیے چھت پر متعین کیا گیا اور باقی افراد سو گئے- صبح بیداری کے بعد یہ لوگ بھوکے بیٹھے ہوئے تھے- کیونکہ راشن تو حویلی میں تھا کہ دن چڑھ آیا۔

حویلی میں سکھ سو کر اٹھے اور رات کی بچی ہوئی روٹیاں اچار سے کھانے لگے۔ سالن ختم ہو چکا تھا بچ بھی جاتا تو گرمی کے حبس زدہ موسم میں اب تک خراب ہو جاتا۔

سکھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ دو سکھوں نے حویلی کا جائزہ لیا۔

"مُسلے سالے سب کچھ ساتھ لے گئے-

خالی پڑی ہے حویلی"-

"چلو چلتے ہیں"

دوسرے نے کہا

"اس کا کیا کرنا ہے" ایک نے امام مسجد کی طرف اشارہ کیا-

دوسرے سکھ نے تلوار سونتی اور امام مسجد کا سر گردن سے جدا کرنے لگا تھا کہ ایک اور سکھ بولا-

"اس کو چھوڑ دو- دن نکل آیا ہے۔ چلو"

"چل تو بھی کیا یاد کرے گا مولوی تری جان بخشی"-

تلوار والا سکھ بولا-

یہ کہہ کر وہ ایک ایک کر کے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے-گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور گاؤں سے نکل گئے-

امام مسجد کی جان بچ گئی-اس نے کلمہ شکر پڑھا۔احتیاطاً ایک گھنٹہ انتظار کیا کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائیں-جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ گاؤں سے دور نکل گئے ہونگے تو وہ اپنے گھر والوں کو بلانے چلا گیا-

سب حویلی پہنچے اور کھانے پکانے کی تیاری کرنے لگے-دو عورتوں نے فٹافٹ آٹا گوندھا-دو نے تنور تاپا(جلایا) باقی پیاز، ٹماٹر کترنے لگی-انہوں نے جلدی سے انڈوں کا سالن بنایا اور پیٹ بھرا-اس کے بعد انہوں نے متوقع قافلے کے لیے بھی بڑی مقدار میں کھانا تیار کرنا تھا۔

ooooooooo

گورداسپور ضلع پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی-کشمیر کے راستے کی وجہ سے ہندوؤں نے گورداسپور کو پاکستان کا حصہ نہیں بننے دیا۔

گورداسپور کے گاؤں فیض اللہ چک میں حشمت علی خان کی بہت عزت تھی-ان کا خاص مرتبہ اور مقام تھا۔ حشمت علی خان مسلم لیگ کے قائدین میں سے تھے۔وہ جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے-ان کے جوان بیٹے بھتیجے، بھانجے اور بھائی ان کے معاون تھے-اس زمانے میں خاندانی شرافت اور نجابت کی بہت اہمیت تھی-حشمت اللہ خان مہمند حسنہ کے والد عبداللہ خان اور کزئی کے سسر تھے-حسنہ کے نانا تھے۔حسنہ کی والدہ ام کلثوم کے والد تھے۔

وہ زمین دار تھے ۔ اس کے علاوہ ان کی شہری جائیداد بھی تھی-وہ مسلم لیگ سے مالی طور پر تعاون بھی کرتے تھے۔

وہ مسلم لیگ کی اعلی قیادت کے معتمد تھے۔

ان کے ذمے علاقے کے مسلمانوں کا پر امن انخلاء کا کام لگایا گیا تھا۔ سب کو نکالنے کے بعد انہوں نے اپنے خاندان کو نکالنے کا سوچا۔ انکی دو جوان بیٹیاں تھیں جو کنواری ، پردہ دار صوم و صلاۃ کی پابند خوبصورت باحیا

دوشیزائیں تھیں۔ ایک کانام سلمی تھااور دوسری کانام فوزیہ تھا-انکی تین جوان بہوئیں تھیں۔ پوتے پوتیاں تھے
۔والدین اور بہن بھائی تھے۔ گردونواح سے شادی شدہ بہن بھائی بھی ان کی حویلی میں جمع ہوگئے۔

انہوں نے روانگی کے لیے بیل گاڑیاں تیار کی۔ سامان، بچے اور خواتین بیل گاڑیوں پر سوار تھے اور مرد پیادہ
تھے۔ آٹھ بیل گاڑیوں، چار گھوڑوں چھ بھینسوں اور پانچ گائیوں پر مشتمل یہ کاروان سرگی(فجر) کے وقت حویلی
سے نکلااور نبی پور کے سمت گامزن ہوا۔

انکے مخالفین کانگریس کے کارکن اور مقامی لیڈر ان کی تاک میں تھے۔ مخالفین اس قافلے کے انخلاء کی معلومات
سے باخبر تھے-جونہی قافلہ روانہ ہوا۔ چند میل پر ہندو گھات لگاکر بیٹھ گئے۔ ہندواور سکھ تلواریں سونتے ہوئے
ان پر ٹوٹ پڑے۔

مردوں کوانہوں نے قتل کردیاان کی تعداد زیادہ تھی۔ قافلے کے ساتھ حفاظت کے لیے سپاہی بھی تھے-وہ بھی
مارے گئے۔ عورتوں کو انہوں نے بے آبرو کیا۔ اور پھر قتل کر دیا۔ کنواری لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ بچے مار
دیے۔ آدھے گھنٹے میں لاشوں کے سواوہاں کچھ نہیں رہا۔ مال مویشی اور سامان وہ لوٹ کر لے گئے -یہ مرد
حشمت اللہ خان کی بیٹیوں کو وہ کئی دن تک بے آبرو کرتے رہے-درندے ان معصوم لڑکیوں کو بھنبھوڑتے رہے
-انہیں نوچتے کھسوٹتے رہے-ان کی عزت لوٹتے رہے ان میں سے ایک لڑکی نے موقع ملتے ہی چھت سے کود کر
جان دے دی-دوسری بھاگ گئی اور چھپتی چھپاتی پاکستانی قافلے کی تلاش میں تھی کہ اس پر ایک عیاش سکھ کی
نظر پڑ گئی وہ دلال تھااس نے لڑکی دھندے کے لیے رکھ لی۔

لڑکی کواس نے ایک ہندو سیٹھ کے سامنے پیش کیا۔

ہندو سیٹھ نے اس سے پوچھا۔

"لڑکی تو کون ہے؟ کس علاقے کی ہے؟"

اس نے جواباًاپنی کہانی سنائی۔

ہندو سیٹھ نے پہلے تواس کے ساتھ خوب عیاشی کی۔ پھر اس کی حالت پر ترس آگیا-اس نے سلمی کو سکھ سے خرید
لیااور اسے پاکستانی قافلے کے ساتھ پاکستان روانہ کر دیا۔

وہ نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں -اس کی جسمانی اور ذہنی دونوں حالتیں خراب تھیں۔ اسے والٹن کیمپ لاہور پہنچادیا گیا- جہاں وہ اپنوں کی منتظر اپنے رشتہ داروں کی راہ تکنے لگی۔

○○○○○○○○○○

امام مسجد کا خاندان مہاجروں کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ شدید حبس تھا کہ اچانک آندھی آئی اور ٹھنڈی ہوا چل پڑی -بارش ہونے لگی۔ جس سے گرمی کی شدت میں وقتی طور پر کمی آگئی تھی۔ امام مسجد کے بچے چھت پر بارش میں نہار ہے تھے کہ راہ چلتے ایک اوباش ہندو چور کی نظر اُن پر پڑ گئی -وہ خالی گھروں سے سامان چوری کر کے کباڑ والے کو بیچتا تھا۔ اس نے جا کر اس کباڑ والے کو بتایا- جسے وہ سامان بیچا کرتا تھا -اس نے جا کر سکھوں کے جتھے بردار کو اطلاع دے دی۔

"اچھاتو مُسلے چھپے بیٹھے ہیں چل دیکھتے ہیں"۔

اُس نے جا کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی -وہ سب کرپانیں لے کے نکلے اور حویلی پر دھاوابول دیا۔ امام مسجد کے گھر والوں کو سنبھلنے کا موقع نہ ملاجو "کوڈورڈ"

انہوں نے مقرر کر رکھا تھاوہ بھی

وہ بول نہ سکے۔

سب مرد اور بچے قتل کر کے سکھ جتھے بردار امام مسجد کی عورتوں کو اٹھا کر کے گئے۔

عورتوں کا وہی حشر کیا گیا- جو ہوا کرتا تھا۔ عزتیں لوٹی گئی۔ زبردستی سکھ کیا گیا جو ڈرپوک تھی بیویاں بنالی گئی۔ جو زیادہ بہادر تھی -وہ بچاری زہر کھا کر مر گئ۔ چوہدری اللہ وسایا لنگڑیال کی حویلی کے مکین جو مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ تھ -ے وہ اللہ کے مہمان بن گئے -اس اللہ کے جو سب سے اعلی مہمان نواز ہے۔

○○○○○○○○○○

عظیم خان برکی کا قافلہ جب واہگہ پہنچا تو عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ انہیں رات گزارنے کے لیے وہیں پر ٹھہرا دیا گیا۔

"شکر الحمدللہ"

اپنے وطن آ گئے"

ایک قافلے والے نے کہا-

"اللہ کا کرم ہے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا راستے میں" عظیم خان نے کہا

"جی ابا جی اللہ نے بہت کرم کیا"

رفیق خان نے جوابا کہا

حسنہ کی ماں بولی "میرے مائیکے والوں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میرا دل ہول رہا ہے۔ پتا نہیں کس حال میں ہونگے"۔

ان کو دال اور روٹی کھانے کو دی گئی۔

صبح وہ سب والٹن کیمپ پہنچا دیے گئے۔

"جیسا ہندوستان ہے ویسا ہی پاکستان ہے فرق تو کوئی نہیں"

ایک عورت بولی

"کیا فرق ہو گا ایک روٹی کے دو ٹکڑوں ہیں-پنجاب سے اٹھ کر پنجاب میں آ گئے ہیں ہم"

اس عورت کے شوہر نے جواب دیا۔

گرمی نے سب کا حال برا کر رکھا تھا۔ مرد درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ عورتیں بچاریاں بھی ٹولیوں کی صورت میں اپنی اپنی کہانی سنا رہی تھی۔

سفر کی صعوبتیں، موسم کی سختیاں، بے گھری کے مسائل، بھوک، پیاس کے علاوہ بھی عورتوں کے بے شمار غم تھے۔ کچھ مہاجریں کو راستے میں درختوں کے پتے کھانے پڑے۔ کچھ ایسے تھے جن کے گھر کے لوگ قتل ہوئے -کچھ کی بیٹیاں سکھ اٹھا کر لے گئے۔ اک آہ و بکا کا طوفان تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اک داستان خونچکاں تھی جو لہو سے رنگین تھی۔ ایک ہی دھرتی تھی - لہو کا رنگ بھی ایک ہی تھا۔ پھر کیوں دل مخالف سمت میں دھڑکنے لگے؟

پھر کیوں سر کٹتے رہے؟

کیونکہ اس کی وجہ فرنگی حکمران تھے

اگر وہ چاہتے تو ہندوستان میں کچھ عرصہ قیام کر کے مہاجرین کی آبادکاری کر سکتے تھے-وہ مہاجرین کا پر امن انخلا کروا سکتے تھے لیکن انہیں تو برطانیہ واپس جانے کی پڑی ہوئی تھی۔

انہوں نے اپنی ذمہ داری سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی بھی حوالے سے تقسیم سے متعلق کوئی منصوبہ بندی نہیں کی - کیونکہ یہ ان کا درد سر نہیں تھا_ہندوستانی عوام ان کے نزدیک کیڑے مکوڑوں کی حیثیت رکھتے تھے _انہوں نے انتظامیہ کو کسی سطح پر بھی ہدایات جاری نہیں کی- انتظامیہ کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا۔سیاسی لیڈران حالات کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتے رہے۔ حکام سے مالا قاتیں بھی کرتے رہے -لیکن فرنگیوں نے ان کے خدشات پر کان نہیں دھرے۔

ماسٹر تاراسنگھ کی کرپان لہرانے کے بعد بھی انگریز ٹس سے مس نہ ہوئے -اس وقت کے پنجاب کے گورنر نے اپنی رپورٹس میں صاف صاف ماؤنٹ بیٹن کو لکھا تھا کہ پنجاب میں تصادم اور پر تشدد فسادات کے امکانات ہیں۔ ان کی روک تھام کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ لیکن کچھ نہیں کیا گیا۔

جونہی تقسیم کا اعلان ہوا - ہر طرف پر تشدد فسادات شروع ہوگئے اور ان فسادات میں وقت کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی۔ بے گناہ لوگ مرتے گئے۔

oooooooo

ساتواں باب

پاکستان

رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں! مجھ کو

کہ عبرت خیز ہے تیر افسانہ سب فسانوں میں

انہیں کیمپ میں آئے تین دن ہو چکے تھے۔

والٹن کیمپ میں لوگ اپنے عزیز و اقارب کو ڈھونڈر ہے تھے۔

انہیں کیمپ میں چھ دن گزر چکے تھے۔ ہر طرف آہ وبُکا کا طوفان تھا۔ جو عورتیں زچگی کے عمل سے گزرنے والی تھی۔ انکے لیے زچہ بچہ سنٹر بنایا گیا تھا۔ طبی عملے کی شدید کمی تھی۔ اپنی مدد آپ کی تحت گزارا چل رہا تھا۔

عظیم خان اور رفیق خان بھی حسنہ کی والدہ اُم کلثوم خانم کے مائیکے والوں کو تلاش کر رہے تھے کہ انہیں ایک دراز قامت چوہدری نظر آیا۔ جس کے ساتھ اس کے ملازمین بھی تھے۔ جو لوگوں کی دلجوئی اور مدد میں لگا ہوا تھا۔

انہوں نے غور کیا تو امام مسجد کی بتائی ہوئی نشانیوں پر پورا اترتا دکھائی دیا۔ انہوں نے چوہدری اللہ وسایا لنگڑیال سے ملاقات کی۔ کیمپ میں بھی چوہدری مہاجروں کو کھانا دے رہا تھا۔

انہوں نے چوہدری کا شکریہ ادا کیا اور امام مسجد کی تعریف کی۔ جس پر چوہدری غم گین ہو گیا اور بولا

"ساتھ والے گاؤں سے ہمارے کچھ رشتہ دار قافلے کے ساتھ آئے ہیں- ابھی ابھی پہنچے ہیں- انہوں نے بتایا ہے کہ وہ سب تو اللہ کے پاس چلے گئے۔ اب ان کے لیے دعا کریں۔"

انہیں امام مسجد کا مسکراتا ہوا چہرہ اور اسکی مہمان نوازی یاد آئی۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس نے مہاجرین کی مدد کی تھی۔

"اللہ درجات بلند فرمائے" انہوں نے دعا کی

جب انہوں نے جا کر اپنے رشتہ داروں کو بتایا تو سب ہی افسردہ ہو گئے۔

دوسرے دن صبح انہیں حشمت علی خان کی بیٹی سلمی نظر آئی۔ وہ پراگندہ حلیے میں بدحواس اور بے حال لگ رہی تھی۔ رفیق اسے اپنی ساس اُم کلثوم خانم کے پاس لے آیا۔

وہ پھوپھی کے گلے لگ کر بہت روئی اور خاندان کے ساتھ ہوئے سانحے کی روداد کہہ سنائی۔ حسنہ کی والدہ ام کلثوم خانم بچھاڑیں کھانے لگی۔ وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی اس کا سارا خاندان شہید ہو گیا تھا۔ حسنہ بھی ماں کے ساتھ رو رو کے بے حال ہو رہی تھی۔ باقی رشتہ دار بھی غم زدہ تھے۔

ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ لٹے پٹے مسلمان آگ اور خون کا دریا پار کر کے ہندوستان سے لاہور آ رہے تھے۔

لاہور میں ان مہاجروں کا اندراج کیا جاتا۔

پھر انکے کلیم کے مطابق لاہور سے ریل کے ذریعے انہیں کراچی بھیج دیا جاتا - یہ وہاں سے باقی شہروں کو بھی پہنچ جاتے تھے۔ لاہور کے مغل پورہ اسٹیشن پر زندہ افراد کو اتار کے کیمپ میں لایا جاتا اور لاشوں کو آگے بھیج دیا جاتا جہاں انہیں اجتماعی قبروں میں دفنا دیا جاتا۔

لاہور کی زمین ایسی اجتماعی قبروں سے بھر گئی۔

ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے قافلے اس حالت میں پاکستان پہنچ رہے تھے کہ ان کے دل اور بدن تھکان سے چور تھے - یہ لوگ کئی کئی دنوں سے فاقے کا شکار تھے کئی مرد اور عورتوں ایسی حالت میں پہنچے کہ انکے جسموں پر کپڑے کی ایک دھجی تک نہ تھی - یہ مسلمان - بالکل برہنہ حالت میں تھ -ے ہندوؤں نے یہ کہہ کر ان کے کپڑے اتروا لیے تھے کہ اپنے ملک جا کر اپنے ملک کے کپڑے پہننا۔ جوتوں سے عاری ان کے پاؤں چل چل کر زخمی ہو چکے تھے - کئی ضعیف افراد اور بچے پاکستان پہنچتے ہی دم توڑ گئے - بیمار اور زخمی کراہ رہے تھے - کوئی پُرسانِ حال نہ تھا - فوری طبی امداد بہم پہنچانے کی ضرورت تھی۔ بے شمار لاشیں راستوں پر اور میدانوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ کئی مہاجر سڑکوں پر پڑے ہوئے تھے - ان کے پاس رہنے کی جگہ نہیں تھی - لوگ اپنا سب کچھ لٹا کر آ رہے تھے اور فٹ پاتھوں، پارکوں، سڑکوں کے کنارے، میدانوں میں بے آسرا اور بے یارو مددگار کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور تھے۔ فوت شدہ کے کفن دفن کا جلدی انتظام کرنا تھا - گرمی سے لاش خراب ہو رہی تھی - ان لاشوں کے سڑنے سے بیماریوں کے پھیلنے کا اندیشہ بھی تھا۔

جو عورتیں پورے دنوں سے تھیں انہیں ڈلیوری کی سہولیات کی ضرورت تھی اور جو راستے میں بچے جن (پیدا) کر آئی تھی - ان کے ساتھ بھی صحت کے مسائل تھے۔ پناہ گزینوں کی دردناک حالت ان کیمپوں میں دیکھی جا رہی

تھی جو والٹن ٹریننگ اسکول اور ہوائی اڈے پر بنائے گئے تھے - پاکستان بننے کے بعد قائداعظم نے پہلا ریفیوجی کیمپ کا دورہ کیا تو قائد کی آنکھیں پناہ گزینوں کی ابتر حالت دیکھ کر بھیگ گئی۔ انہوں نے مسائل کے حل کی تاکید کی۔ وسائل کی کمی کے حل کو جذبے کی شدت سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ کل کے بادشاہ آج کے فقیر بنے فرش پر بیٹھے تھے۔ بہت بڑی قیمت ادا کی گئی تھی آزادی کی۔ ایسا سانحہ کسی اور زمین، کسی اور دھرتی، کسی اور خطے میں برپا نہ ہوا- جس ہندوستان کی زمین پر ہوا۔ پھر ایک اور آفت آگئی- کیمپوں میں آباد مہاجرین نے کیمپوں کے ارد گرد گندگی کے ڈھیر لگادیے- دیہات میں تو یہ لوگ رفع حاجت کے لیے کھیتوں میں جاتے تھے۔ یہاں کیمپ کے ارد گرد ہی ہگنے (رفع حاجت سے فارغ) لگے۔ ہیضہ ملیریا، بد ہضمی، قے، دست اور سانس کی بیماریاں پھیل رہی تھی کہ

اگست میں ہونے والی بارشوں کی وجہ سے کیمپ میں گیسٹرو کی وبا بھی پھیل گئی برسات کا موسم، خوارک کی کمی اور ادویات کی عدم دستیابی نے بیماریوں کی شدت کو خطرناک حد تک بڑھا دیا جس کے باعث مشرقی پنجاب کی تلواروں، کرپانوں، خنجروں، نیزوں سے بچ کر مملکت پاکستان پہنچنے والے تیزی سے وبائی امراض کا شکار ہو کر مرنے لگے۔

تقریباًاسی ہزار مہاجرین پیدل واہگہ پہنچے اورانیس ہزار تین سو کی تعداد لاہور میں والٹن کیمپ پہنچی۔

مسائل تھے کہ حل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ حسنہ کے والد عبداللہ خان اور کزئی اور اسکے سسر عظیم خان برکی کو الاٹمنٹ ملنے کا انتظار تھا- آخر کار دس دن کیمپ میں گزارنے کے بعد ان دونوں خاندانوں کو کلیم میں زمین اور مکان مل گئے۔

عظیم خان برکی کو ڈبہ والا گاؤں میں زمین اور مکان الاٹ ہوا۔

جب کہ عبداللہ خان اور کزئی کو فیصل آباد کے ایک نواحی گاؤں چک انیتس میں زمین اور مکان مل گیا۔ دونوں خاندان کیمپ سے اسٹیشن پہنچے اور ریل گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے پہلے عبداللہ خان اور کزئی کی منزل آگئی اس کے بعد عظیم خان برکی کا اسٹیشن آگیا۔

آٹھواں باب

ڈبہ والا

ڈبہ والا کا خوبصورت سر سبز اسٹیشن دیکھ کر ان کی طبعیت خوش ہو گئی۔

"ایہہ تے ساڈے نکودر نالوں وی سوہنا پنڈ آں"

(یہ گاؤں تو ہمارے نکودر سے بھی زیادہ خوبصورت گاؤں ہے)

-حسنہ کی ساس محمد بی بی بولی

"نکودر ساڈا نئیں ہندستان دا پنڈ آ-

بے بے"

(نکودر ہمارا نہیں ہندوستان کا گاؤں ہے امی)

رفیق نے جواب میں کہا

محمد بی بی آہ بھر کے رہ گئی۔

"اب تو یہیں مرنا جینا ہے-پُرکھاں دیاں قبراں توں دور"

(بزرگوں کی قبروں سے دور)

عظیم خان بولا

اسٹیشن کی عمارت پیلے رنگ کی تھی- چھوٹی تھی لیکن خوبصورت تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے ساتھ اسٹاف کے لیے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ویٹنگ ایریا تھا-

وہ اسٹیشن سے باہر نکلے تو ایک ہینڈ پمپ نظر آیا۔ وہ سب وہاں سے پانی پینے لگے -منہ ہاتھ دھویا اور تازہ دم ہوئے انہیں ایک پگڈنڈی نظر آئی

"یہی گاؤں کو جاتی ہو گی اور تو کوئی راستہ نہیں ہے"۔ عظیم خان نے کہا

وہ اسی پگڈنڈی پر چلنے لگے -راستے میں مربعوں میں مختلف فصلیں لگی ہوئی تھی۔ سبزیاں بھی تھی اور مالٹے کے باغ بھی تھے۔ آدھے راستے میں نہر آگئی سب بیٹھ کر سستانے لگے -نہر کے کناروں پر کھٹل بوٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ توڑ کر منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد پھر وہ چل پڑے۔ ڈھائی مربع بعد گاؤں کے آثار نظر آئے۔ بڑی بڑی چار ڈِگیاں (تالاب) نظر آئی جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک مسجد دکھائی دی۔ مسجد ویران تھی اور قابلِ مرمت بھی تھی۔ اس کے بعد مکانات شروع ہوگئے۔ راہ چلتے ایک مقامی دیہاتی سے مکان کا پتا پوچھا- اس کی رہنمائی پر وہ الاٹ شدہ مکان پر پہنچے -یہ ایک کشادہ مرکزی گلی تھی تقریباً سو فٹ چوڑی۔

مکان کے سامنے بیس فٹ چوڑا چبوترا تھا۔ مکان دو ہزار گز پر بنا ہوا تھا۔

دروازے سے اندر بیٹھک تھی -جو بڑے ہال کمرے میں کُھلتی تھی- اس کے ساتھ دو چھوٹے کمرے تھے۔ جن کے دروازے ہال کمرے میں کھلتے تھے۔ اور ہال کمرے کا مخالف دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ اس کشادہ صحن کے اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ بڑے سائز کے کمرے۔ ایک گودام بھی تھا - جس کی دیوار میں ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی -جس کی لمبائی چھت تک تھی اور چوڑائی پانچ فٹ تھی۔ اس میں گندم کا زخیرہ موجود تھا ۔اچار کی برنی ایک میز پر دھری ہوئی تھی۔ جس میں خوشبودار اچار تھا۔ اسی گودام کے ایک حصے میں برتن بھی رکھے ہوئے تھے -چنگیریں، توا، چمٹا، پھونکنی، چائے کے لیے چینی مٹی کے پیالے، تانبے کی کٹوریاں، تانبے کے گلاس، تانبے کے بھاری برتن، دیگچے پتیلے، آٹا بنانے کی چکی، مٹی کے گھڑے وغیرہ بھی رکھے تھ -ے مٹی کے برتن بھی تھے -مٹی کی کنالِیاں بڑے چھوٹے سائز میں موجود تھی۔ چارپائیاں بھی تھیں -ایک چارپائی پر بستر تہہ در تہہ رکھے ہوئے تھے۔ واہی بیجی (کھیتی باڑی) کے اوزار دوسرے کونے میں پڑے تھے -دیوار کے ساتھ خشک بالن (ایندھن) رکھا ہوا تھا- وہ سب صحن میں کھڑے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں مرغیوں کا ڈربہ بنا ہوا تھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔

رفیق نے گودام سے چارپائیاں نکال کر بچھائی وہ سب ان پر لیٹ، بیٹھ گئے۔

"ہائے ساڈا نکودر دا مکان۔ ہائے"

(ہائے ہمارا نکودر والا گھر)

عظیم کی والدہ بولی۔

"ماسی قسمت داہیر پھیر آں اجاڑاسانوں تاں مار گیا۔"

(خالہ قسمت کے کھیل ہیں بٹوارہ ہمیں تو مار گیا)۔

یہ کہہ کر محمد بی بی رونے لگی باقی عورتیں بھی اس کا ساتھ دینے لگی۔ مردوں کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے۔ رودھو کر جب سب کا جی ہلکا ہو گیا تو محمد بی بی اور اس کی بیٹی صفیہ آٹے والی چکی پر آٹا پیسنے لگی۔ محمد بی بی کی ساس گرد سے اٹے ہوئے برتن دھونے لگی - رفیق کی چھوٹی بہن پروین گھڑا سر پر رکھ کر جمیل کے ساتھ ڈگی سے پانی بھرنے چلی گئی۔

وہ باری باری چار گھڑے بھر کر لائی - عورتیں صحن میں بنا چولہا جلانے لگی۔ روٹیاں بن گئی تو انہوں نے اچار کے ساتھ روٹیاں کھائی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

بہت یاسیت زدہ ہو کے محمد بی بی نے کہا!

"اس گھر میں پتا نہیں کون رہتا ہو گا جس میں آج ہم بیٹھے ہیں؟

ہمارے نکودر والے گھر میں کون آباد ہوا ہو گا؟

ان کچی دیواروں کو کن ہاتھوں نے لیپا ہو گا؟

یہ اچار کے آم کس نے کاٹے ہو گے؟

یہ گندم کس نے اُگائی ہو گی۔ ہل چلانے والے ہاتھ کس کے ہونگے۔

یہ چارپائیاں جن پر ہم لیٹے ہوئے ہیں - کس کے ہاتھوں نے بُنی ہو گی

کوئی سکھ خاندان ہو گا یا مسلمان خاندان؟ شاید اس گھر میں سکھوں کا خاندان آباد رہا ہو گا۔ وہی سکھ جن سے ہم جان بچا کر بھاگے ہیں - وہی سکھ ہیں - یہ وہی سکھ ہیں"

یہ سن کر سب کی آنکھیں اشکبار ہو گئی۔

حسنہ خاموش لیٹی ہوہی تھی - اسے اپنے نانکے "(ننھیال) یاد آرہے تھے۔ اس کا بیٹا کبیر تھک کر سو چکا تھا۔

روتے روتے حسنہ کی بھی آنکھ لگ گئی۔

"ہائے میری نو نمانی (بہو)

ایدے تاں نانکے ہی وڈے گئے "

(ہائے میری بہو اس کے تو ننھیال والے ہی مارے گئے بچاری)

محمد بی بی حسنہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

شام ہوئی تو مرد گاؤں دیکھنے چلے گئے۔

مغرب ہوئی تو مرغیاں باہر گلی سے آکر ڈربے میں گھس گئی۔ جمیل نے ڈربے کا دروازہ بند کر دیا۔ مرغیاں تعداد میں کل دس تھی۔ تین مرغے تھے ٹوٹل تیرہ۔ صبح ڈربے سے سات انڈے ملے۔

ناشتے کے بعد کلیم میں ملی ہوئی زمین کی پیمائش کرواکر عظیم خان گھر واپس آگیا۔ اس کے کھیت کا رقبہ نکودر کے کھیت کے برابر تھا- کپاس کی فصل لگی ہوئی تھی - عظیم خان نے چار دن لگا کر اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ کپاس چنُی پھر بوریوں میں بھر کر ٹوبہ ٹیک سنگھ جا کر بیچ آئے۔ اس نے دیسی گھی کا کنستر، دالیں، مرچ مصالحے، صابن اور کپڑے خریدے ایک سلائی مشین بھی خریدی۔ اس کی بیٹی پروین بہت اچھی سلائی کرتی تھی- اس کی سلائی مشین جالندھر میں رہ گئی تھی۔

سب کچھ میسر تھا۔ جیسی آب و ہوا چھوڑ کر آئے تھے - ویسا ہی موسم تھا۔ ویسی ہی دھرتی تھی۔ لیکن سب افسردہ تھے- اسی افسردگی میں دن رات گزرنے لگے۔

عورتیں چیزوں کا موازنہ نکودر کی چیزوں سے کرتی رہتی۔

مرد کھیت کھلیان کا موازنہ کرتے۔

سب کچھ مل گیا جو چھوڑ کر آئے تھے نہ کم نہ برابر۔ اتنا ہی جتنا چھن گیا تھا۔

لیکن دل۔ دل تو کہیں ہندوستان کی فضا میں رہ گیا تھا۔

دن بھر مرد کھلیانوں میں اور عورتیں گھروں میں کاموں میں مصروف رہتی لیکن جب رات آتی تو اپنے ساتھ یادوں کی بارات بھی لے آتی - تھکے ماندے بدن نیند کے لیے بے قرار ہوتے اور دل و دماغ ہندوستان کی یاترا کے لیے مچلتے رہتے۔ بدن کی تھکاوٹ غالب آجاتی اور وہ سو جاتے۔

انہیں ڈبہ والا گاؤں میں رہتے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ رات کے تین بجے اچانک عظیم خان کی آنکھ کھل گئی- بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے خواب میں اپنے والد ندیم خان اور کزئی کو دیکھا تھا جو کہ اس سے کہہ رہے تھے

"زیے پتر کئی دن ہو گئے تو گیڑا ہی نہیں ماریا- یار تو سانوں بھل گیا آں"

(عظیم بیٹا کئی دن ہو گئے تم نے چکر نہیں لگایا یار تم ہمیں بھول گئے۔)

عظیم خان کا دل غم سے پھٹنے لگا وہ دبے قدموں چلتا ہوا چھت پر چلا گیا اور وہاں اکیلا بیٹھ کر بہت رویا۔ اسے اپنے والد، دادا، دادی بہت یاد آئے۔ وہ گھر کا پہلا پوتا تھا- دادی کا بہت لاڈلا تھا۔

جی کا بوجھ ہلکا کر کے نیچے آیا تو فجر کا وقت ہو گیا- اس نے نماز پڑھی اور رو رو کر اپنے والدین اور دیگر رشتے داروں کے لیے دعا کرنے لگا۔

اور پھر اٹھ کر قبرستان جانے کی نیت سے گھر سے نکلنے لگا تو

محمد بی بی نے پوچھا

"کہاں جا رہے ہیں آپ خان صاحب"

عظیم خان نے جواب دیا

"قبرستان"

"ہمارے پیاروں کی قبریں تو ہندوستان میں رہ گئی آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟"

"یہ بھی تو کسی کے پیارے ہیں"- عظیم خان نے جواب دیا

محمد بی بی رونے لگی

"ہائے ساڈے وڈے"

(ہائے ہمارے اجداد)

گھر کی دیگر خواتین بھی ساتھ شامل ہو گئی۔

عظیم خان نے قبرستان جا کر قبروں کی صفائی کی اور دعا کرنے لگا۔ قبروں کی تعداد کم تھی ۔ مسلمانوں کی تعداد گاؤں میں کم تھی۔ قبرستان سے نکلا تو مسجد میں آگیا۔ اس نے مسجد کی صفائی کی۔ مسجد ویران تھی۔ اذان دی اور دعا کی۔

"اے اللہ اس مسجد کو موذن اور ہمارے گاؤں کو مولوی دے دے -ترا گھر ویران اچھا نہیں لگتا"

وہ گھر لوٹا تو مطلع صاف تھا عورتیں رو دھو کر گھر کے کاموں میں لگ گئی تھی۔

زندگی کسی کے لیے نہیں رُکتی۔ وقت کبھی نہیں ٹھہرتا۔ یہ روانی، یہ بہاؤ انسان کو زندہ رکھتا ہے- ان کی گفتگو میں شامل جالندھر نکودر آہستہ آہستہ پس منظر میں جانے لگا۔

اب ڈبہ والا اس کے قریبی گاؤں، ٹوبہ ٹیک سنگھ، شورکوٹ، جھنگ ان کے گفتگو کا حصہ بننے لگے-

گاؤں کی مسجد کے لیے ایک موذن کا بندوبست ہو گیا۔ خادم حسین امام مسجد بن گیا- گاؤں کے بچے اسکے پاس قرآن پڑھنے جانے لگے۔ حفظ کا کام بھی شروع ہو گیا۔

عظیم خان نے محمد بی بی سے کہا

"رفیقے کے پتر کبیر کو بھی مولوی کے پاس بٹھا دیتے ہیں قرآن حفظ کر لے گا"

"نہ نہ میرا پوتڑا (پوتا) گاؤں کے گھر گھر جا کر سوکھی روٹیاں اکھٹی کرے- یہ مجھے گوارہ نہیں ہے- رہنے دیں خان صاحب"

محمد بی بی نہیں مانی۔

ooooooooo

برمنگھم کا موسم بدل رہا تھا- سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پیٹر نے اپنی مدد کے لیے ایک پاکستانی نوجوان دوکان پر ملازم رکھ لیا تھا۔ یہ نوجوان لاہور کا رہنے والا تھا اس کا نام رشید خان تھا- یہ ایک ماہ قبل برطانیہ آیا تھا- اس نے یہاں وہاں دھکے کھائے - پھر پیٹر کی فرنیچر کی دکان میں اسے ملازمت مل گئی۔ وہ تین ماہ سے کام بھی کر رہا تھا اور خوش بھی تھا- پیٹر اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ رشید کا خاندان تقسیم ہندوستان سے قبل لاہور میں آباد تھا۔ بٹوارے کے لرزہ خیز مناظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ان کے رشتے دار ہندوستانی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اس کے والد لاہور میں فرنیچر کا کاروبار کرتے تھ -ے اسی لیے برمنگھم میں اس نے پیٹر کے پاس ملازمت کر لی۔ اس کی والدہ پاکستان لاہور میں اس کے لیے لڑکیاں تلاش کر رہی تھی۔ بٹوارے نے رشتہ داروں کو بے ٹھکانہ کر دیا تھا- اسی لیے بر تلاش کرنا آسان نہیں تھا

ooooooooooo

محمد بی بی کو اپنی بھوری مجھ (بھینس) کے نکودر رہ جانے کا بہت ملال تھا۔ عظیم خان نے اسے ایک بھینس خرید دی۔

"میری بھوری ورگی (جیسی) نہیں آں

ہائے میری بھوری"

محمد بی بی رونے لگی۔ سب افسردہ ہو گئے۔

حسنہ کی اداسی عظیم خان سے دیکھی نہیں جاتی تھی - اس نے رفیق سے کہہ کر حسنہ کو مائیکے بھجوا دیا -

رفیق اور حسنہ ٹرین کے ذریعے فیصل آباد پہنچے وہاں سے انیتس چک جانے کے لیے سالم ٹانگہ لیا۔ وہ دوپہر کے کھانے پر پہنچ گئے۔ حسنہ ماں سے لپٹ کر بہت روئی۔ زخم تازہ ہو گئے تازہ کیا ہوئے - ابھی تو بھرے ہی نہیں تھے ۔ کھرنڈ آئے تھے۔ جو اتر گئے - رفیق رات وہی رہا پھر حسنہ کو اس کے مائیکے چھوڑ کے واپس اپنے گاؤں آ گیا - حسنہ ماں اور بہنوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی باتیں کرتی رہتی - اس کا جی وقتی طور پر بہل گیا - چھوٹی بہن محمودہ ننھے کبیر کو ہر تھلی کا چھالا بنائے رکھتی۔

"کتنا پیارا ہے کاکا۔"

"ہاں اللہ زندگی والا کرے۔"

ام کلثوم نے آہ بھر کر کہا۔

حسنہ ماں اور بہن کے ساتھ محمودہ کے جہیز کی تیاری میں لگ گئی۔ کپاس کی تازہ فصل اتری تھی۔ ام کلثوم شہر جا کر شنیل کا تھان خرید لائی۔ رضائیوں کے کور سینے کے بعد ان میں روئی بھری گئی۔ حسنہ ، محمودہ اور ام کلثوم نے (گدوئی) بڑی سوئی سے نگندا (رضائی میں ہونے والی سلائی) کی۔

حسنہ کو دو ہفتے بعد اس کا بھائی ڈبہ والا گاؤں واپس چھوڑ گیا۔

چار ماہ بعد حسنہ کے گھر بیٹی پیدا ہوئی۔

جس کا نام دادے نے فاطمہ رکھا۔

شدید گرمی کا موسم تھا - جون کا مہینہ تھا۔ حسنہ کو۔ جلے میں ساس مقوی غذا بنا کر دیتی۔ گرم خوراک کھا کھا کے حسنہ کا گلا پک گیا۔

بچی کی دعوتِ عقیقہ پر حسنہ کے والدین کو بلایا گیا۔

"رب سوہنے نے خوشی دکھائی بہت دن گزرے روتے دھوتے"

محمد بی بی نے اپنی کڑھمنی (سمدھن) سے کہا۔

"بس قسمت میں جو لکھا تھا جنہوں نے جانا تھا۔ چلے گئے۔ ہمیں روتا چھوڑ گئے۔"

اُمّ کلثوم بولی

دعوت کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ گاؤں میں ہجرت کر کے آئے دوسرے مسلمان گھرانے بھی مدعو تھے۔ مسلمان ہی رہ گئے تھے۔ سکھ اور ہندو تو چلے گئے تھے۔

دعوت تو عظیم خان نے دے دی تھی لیکن گاؤں میں کوئی نائی نہیں تھا۔ سالن محمد بی بی نے بنایا۔ روٹیاں تنور پر لگائی اور میٹھے میں حلوہ بنالیا۔

"یاد ہے رفیق کے ابا کبیر کے عقیقے کی کیا شان تھی۔ کیسا اعلی انتظام تھا۔"

محمد بی بی بولی

"یاد ہے ۔وقت وقت کی بات ہے"

عظیم خان بولا

سب چہروں پر خوشی تھی۔ غم بہت بڑا دیا تھا قسمت نے۔

اب خوشیوں کے دن آنے والے تھے۔

حشمت خان کی بیٹی سلمی ام کلثوم کے ساتھ رہتی تھی۔ دعوت پر بھی اس کے ہمراہ آئی تھی۔

دعوت کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو عظیم خان سے اس کی بیوی محمد بی بی نے کہا

"اُم کلثوم صفیہ کے لیے رشتہ بتا کے گئی ہے"

"کس کا رشتہ بھلیے لوکے۔"

"وہ عبد اللہ خان کے چچیرے بھائی کی بیوی کے بھانجے کا رشتہ ۔ لڑکا ولایت گیا ہوا ہے وہاں فرنیچر کی دکان پر کام کرتا ہے۔ انہیں اچھی خاندانی سگھڑ لڑکی چاہیے"۔

"اچھا سوچتے ہیں۔ میں بے بے سے مشورہ کرتا ہوں۔ وہ ان پٹھانوں کو پیچھے سے جانتی ہو گی۔ گوت ملالے گی" محمد بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب رفیق نے ماں سے مشورہ کیا تو وہ بولی۔

"وہ تو اچھا خاندان ہے ۔ان کے خون میں سات پشتوں سے رلا (ملاوٹ)۔ نہیں ہے

رفیق خان تو اللہ کا نام لے کر بسم اللہ کر دے۔"

جی بے بے"

رفیق خان نے تابعداری سے جواب دیا۔

ماں سے مشورے کے بعد عظیم خان نے اپنے سمدھی عبداللہ خان کو خط لکھ کر مثبت جواب دے دیا اور لڑکے والوں کو آنے کا کہہ دیا۔

دو ہفتے بعد رشید خان کی والدہ، اس کا والد وحید خان کاکڑ اور بڑا بھائی حمید خان بردکھوے کے لیے آ گئے۔ انہیں صفیہ بہت پسند آئی – وہ تین دن گاؤں میں رہے خوب گنے کھائے، چھلیاں کھائی، گڑ کھایا۔ کھیتوں کی سیر کی – ساگ اور مکئی کی روٹیاں کھائی۔

جاتے ہوئے گاؤں کی سوغاتیں انکے ساتھ باندھ دی گئی۔

اس نے ان کو رشید خان کی تصویر دکھائی –صفیہ کے گھر والوں نے تصویر دیکھ کرہاں کر دی

وہ صفیہ کے ہاتھ پر شگن بھی رکھ گئی۔

سب گاؤں والے صفیہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ ذات برادی میں بھی عظیم خان کی بلے بلے ہو رہی تھی۔

اب عظیم خان کو جمیل کی شادی خانہ آبادی کی فکر تھی اس نے محمد بی بی سے کہا۔

"میں سوچتا ہوں صفیہ کے ساتھ جمیل کا کم (کام) بھی نبیڑ (مکمل) دوں کوئی لڑکی ہے تری نظر میں"

"بس بٹوارہ ہو گیا تو سب بکھر گئے۔ پٹھانوں کے خاندان کہاں گئے۔ کہاں آباد ہوئے سب سے رابطہ نہیں رہا– کچھ کی خبر ہے –کچھ کی خبر نہیں۔

میرا چاچا کا خاندان کہاں گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔ اس کی جوان سوہنی تیاں (بیٹیاں) تھیں۔ ایک سے ایک سوہنی

ان کی خبر مل جائے تو رشتہ کر لیں گے"

محمد بی بی نے جواب میں کہا

"نیک بخت جن کی خبر نہیں ہے انہیں تلاش نہیں کر سکتے ہم – جن سے رابطہ ہے ان میں سے کوئی ڈھونڈ لے"۔

"بستی کے پٹھان تو لاہور، گوجرانوالہ، جھنگ فیصل آباد میں آبسے ہیں۔ان میں سے کسی کی لڑکی دیکھ لیتے ہیں - میری خالہ کی دھی فیصل آباد وکیلاں دی (کی) گلی میں رہتی ہے اس سے پوچھتی ہوں -خط لکھتے ہیں اس کو -کوئی لڑکی بتادے ہمیں "۔" محمد بی بی نے کہا

"لڑکی ترے سامنے ہے محمد بی بی"

کون؟

"حسنہ کی بہن محمودہ"

نہ نہ رفیق کے ابا وہ بہت اتھری (منہ زور) کڑی (لڑکی) ہے -ہمارے ساتھ رہے گی تو تنگ کرے گی"

"شادی سے پہلے بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بعد میں ٹھیک ہو جاتی ہے "

"مگر ہماری حسنہ تو ایسی نہیں ہے"

محمد بی بی بولی

اس کی بات سن کر رفیق خان چپ ہو گیا-

ooooooooooo

نواں باب

حویلی

محمد بی بی کا بھائی اکبر عیار آدمی تھا۔ اس نے رشوت دے کر کلیم میں ایک حویلی منظور کروالی۔ جس کا رقبہ انکے ہندوستانی مکان سے چھ گنا زیادہ تھا۔

وہ اپنی والدہ کو ساتھ لے کر ٹانگے پر سوار ہوا اور اور حویلی دکھانے لے گیا۔ اس علاقے کی آبادی سے ذرا ہٹ کر اونچی دیواروں سے متصل لکڑی کے کنڈے والے بڑے سارے گیٹ کے سامنے ٹانگہ رکا اور وہ نیچے اترے۔

ٹانگہ والے کو انتظار کا کہہ کر وہ اندر داخل ہوگئے -وسیع و عریض صحن کے بیچوں بیچ فوارہ لگا ہوا تھا۔ جس کا پانی ایک حوض میں گر رہا تھا بطخوں کی ایک جوڑی پانی پر تیر رہی تھی۔

محمد بی بی کی والدہ کی حیرت سے آنکھیں پھٹ گئی۔

"اتنی بڑی حویلی ہماری ہے اکبر"

"جی اماں"

اکبر والدہ کو حویلی کی سیر کروانے لگا۔ حویلی قیمتی سامان سے آراستہ تھی۔ بہت بڑے سائز کا مہمان خانہ جس میں قالین صوفے لگے ہوئے تھے۔ رہائشی کمرے بھی اعلی سامان سے مزین تھے۔ رسوئی میں برتنوں کا زخیرہ تھا۔ بوریاں دانوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا حویلی کا ہندو مالک خالی ہاتھ ہندوستان گیا ہے۔

اس حویلی کا مالک سارے خاندان سمیت فیروز پور شادی میں گیا ہوا تھا۔ کہ فسادات شروع ہوگئے وہ واپس نہیں آیا۔ اکبر خان اور اس کی والدہ کے وارے نیارے ہوگئے۔

اکبر خان کی والدہ موقع پرست، کائیاں، نمود و نمائش کی شوقین خاتون تھی۔ وہ اپنی بیٹی محمد بی بی کا الٹ تھی۔ ہندوستان میں بھی ان کی سہیلیاں امیر طبقے سے تھی۔ ایک ان کی سہیلی رام پور کی نواب زادی تھی۔ اکبر خان کی والدہ قدسیہ بیگم اپنی اس سہیلی کی نقالی کرتی تھی۔ ویسا لباس پہنتی۔ اس جیسا تلفظ اختیار کرنے کی کوشش کرتی۔ شہر میں رہتی تھی -ان کو اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔

یہ حویلی ان کے خواب پورے کرنے والی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ حویلی سے ملحقہ ایک باغ تھا

"یہ باغ بھی ہمارا ہے ؟

"نہیں اماں"

اکبر بولا

"تو تم اسے اپنے نام کروالو اکبر۔ کل کو یہ زمین بہت مہنگی ہو جائے گی۔"

قدسیہ بیگم نے مشورہ دیا

اکبر کی آنکھیں لالچ سے چمکنے لگی۔

دوسرے دن وہ اپنا سامان لے کر حویلی میں آ گئے۔

اکبر خان کی بیوی، بھابھیاں اور چھوٹی کنواری بہنیں حویلی دیکھ کر حیران رہ گئی۔

جو سامان وہ ہندوستان سے لائے تھے -وہ جوں کا توں گودام میں رکھوا دیا گیا۔ حویلی کے قیمتی سامان کے سامنے وہ سامان بے وقعت تھا۔

اب قدسیہ بیگم کو اپنے ارمان پورے کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے جہازی سائز کا تخت پوش بنوایا۔ اسے بر آمدے میں رکھوایا- وہ غرارہ زیب تن کرتی- تیار ہوتی اور تخت پوش پر بیٹھ کر پنکھا جھلتی رہتی۔ ساتھ سونے کا بنا پاندان رکھا ہوتا۔ یہ پاندان انہیں ان کی نواب سہیلی نے تحفے میں دیا تھا۔ قدسیہ بیگم کو پان کھانے سے رغبت نہیں تھی۔ پان صرف خاص مہمانوں کے لیے منگوائے جاتے۔ عام حالات میں پاندان خالی ہوتا۔ پاندان کے ساتھ مرزا غالب کا دیوان رکھا ہوا تھا جو قدسیہ بیگم کبھی کبھی اپنی قابلیت کا رعب جھاڑنے کے لیے پڑھتی تھی۔

خود کو انہوں نے نواب بیگم مشہور کروا دیا۔ کام کے لیے ملازمائیں رکھ لیں۔

دوسری طرف اکبر خان نے رشوت دے کر ملحقہ باغ بھی اپنے نام کروالیا۔

اب ان کے وارے نیارے ہو گئے۔ سوائے اکبر خان شروانی کے والد کے۔ اسلم خان شروانی کے علاوہ سب خوش اور مگن تھے۔ اسلم خان اپنی زوجہ کے برعکس تھے۔ محمد بی بی کی عادات بھی والد پر گئی تھی -جب کہ اکبر ماں کا عکس تھا۔ قدسیہ بیگم طرح دار

،طنطنے والے خاتون تھی۔ پٹھان زادی تھی ،شکل و صورت خوب تھی۔ قد کاٹھ اچھا تھا۔ جسم بھرا بھرا تھا لیکن موٹاپا نہیں تھا۔ چبا چبا کر اردو بولتی تھی۔ محاوروں کا بکثرت استعمال کرتی تھی۔ میر و غالب کے اشعار بھی گفتگو میں شامل کرتی تھی۔ ان پر سچ مچ نواب زادی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے پاس ساڑھیوں کا ایک انبار تھا۔ ہیل والی جوتیاں انہوں نے جمع کرر کھی تھی -وہ اپنی ٹپ ٹاپ کا بے حد خیال رکھتی تھی۔

اسلم خان سادہ مزاج تھے -نمود و نمائش سے دور تھے۔ وہ قدسیہ بیگم کے رنگ ڈھنگ دیکھتے رہتے اور سمجھاتے رہتے تھے۔

"اکبر کی ماں۔

اکبر کی ماں"

اسلم خان پکارے

"ایک تو میں نے ہزار دفعہ سمجھایا ہے مجھے اکبر کی ماں مت کہا کریں-قدسیہ بیگم کہا کریں"

قدسیہ بیگم خفگی سے بولی

"اس سے کیا ہو گا۔ رہو گی تو تم اکبر کی ماں

اسلم خان نے جوابا کہا"

خیر" اس بحث کو چھوڑو- میں سوچ رہا ہوں محمدی بی کی طرف چلتے ہیں - ملاقات بھی ہو جائے گی اور اس کا گھر بار بھی دیکھ آئیں گے۔"

قدسیہ بیگم کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن مصلحتاً کہنے لگی

"ٹھیک ہے"

قدسیہ بیگم کو محمدی بی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا- محمدی بی کا نام اس کے دادا نے رکھا تھا۔ قدسیہ بیگم محمدی بی کا نام نوابی انداز کا رکھنا چاہتی تھی لیکن ان کی دال نہ گل سکی۔

محمدی بی کی تربیت بھی اس کی دادی نے کی تھی۔ محمدی بی صوم و صلات کی پابند ، سادہ مزاج سگھڑ گھریلو مزاج کی عورت تھی۔ اس کا مزاج ماں کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ پھر اس کا رشتہ بھی اس کے دادا نے گاؤں میں کر دیا تھا۔ داماد اور سمدھیانہ قدسیہ بیگم کے اسٹینڈرڈ کے مطابق نہیں تھا۔

قدسیہ بیگم نے گودام میں جا کر ملازمہ سے ہندوستان سے لائے صندوق کھلوائے اور ان میں جو سامان بالکل بے کار تھا وہ بیٹی کو دینے کے لیے اکٹھا کر لیا۔

سامان کو انہوں نے بہت طریقے سے پیک کروایا۔ اوپر اوپر نئی چیزیں اور نیچے استعمال شدہ چیزیں بندھوادی۔ سامان میں کچھ برتن، کچھ بستر اور آرائشی اشیا تھی۔ یہ سامان قدسیہ بیگم کے خود کے لیے بے کار تھا۔

"ان پینڈووں کو کیا پتا - یہ ہی سامان دیکھ کر خوش ہو جائیں گے - بھوکے ننگے دیہاتی ہیں۔"

قدسیہ بیگم منہ میں بڑبڑائی۔

"کیا کہہ رہی ہو اکبر کی ماں؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔"

وہ اسلم خان سے بولی۔

تار کے ذریعے آنے کی اطلاع شبہ والا دے دی گئی۔

فیصل آباد سے ریل کے ذریعے قدسیہ بیگم، اسلم خان اکبر خان کی بیوی اور بچے ڈبہ والا پہنچے۔

چھ افراد اسٹیشن پر اترے تو عظیم خان رفیق خان اور جمیل خان منتظر تھے۔

ڈھائی مربع کی مسافت قدسیہ بیگم کے لیے عذاب ہو گئی - وجہ تھی ان کی ہیل والی جوتی۔

یہ دیکھ کر عظیم خان بولا

"خالہ جی تسی مری جتی پالوو"

(خالہ جان آپ میرا جوتا پہن لیں)

اس نے اپنا جوتا قدسیہ بیگم کو دے دیا - خود ننگے پاؤں چلنے لگا۔ گھر کے سامنے پہنچ کر دونوں نے اپنے اپنے جوتے واپس پہن لیے۔

محمد بی بی والدین، بھابھی اور بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ البتہ قدسیہ بیگم کے چہرے پر ناگواری تھی۔ انہیں پینڈوؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

محمد بی بی ماں کے آگے پیچھے پھرتی رہتی مگر قدسیہ بیگم کو بیٹی سے بچپن سے چار تھی - وہ صرف اسلم خان کے ڈر سے دنیاداری نبھانے آئی تھی۔

اسے نواسوں، نواسیوں سے بھی پیار نہیں تھا- رفیق، جمیل، صفیہ اور پروین چاروں کو نانی منہ نہ لگاتی- قدسیہ بیگم تیار ہو کر چارپائی پر بیٹھ جاتی اور پنکھا جھلتی رہتی- گاؤں کی مکھیاں، گندگی اور مٹی دیکھ کر وہ برے برے منہ بناتی- ایک دن اپنے داماد عظیم خان سے کہنے لگی۔

"بیٹالاہور میں ہی

کوئی مکان الاٹ کروالیتے - بے شک چھوٹا ہی ہوتا - اس گندے گاؤں سے تو بہتر ہوتا۔"

یہ بات سن کر رفیق بولا -" وڈی اماں پھر تو ہم روزانہ لاہور سے واہی بیجی (کھیتی باڑی) کرنے آتے۔ زمین تو ہماری اس گاؤں میں ہے۔"

یہ سن کر قدسیہ بیگم برا سے منہ بنا کر رہ گئی۔

تین دن ان لوگوں نے قیام کیا۔ مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ گاؤں کی سوغاتیں پیش کی گئی۔ واپسی پر محمد بی بی نے ماں کو اپنی جوتی دی۔ ہیل والی جوتی قدسیہ بیگم نے سامان میں رکھی - اور فیصل آباد واپس آ گئ-

oooooooooo

عظیم خان اور محمد بی بی نے حسنہ کی بہن محمودہ کا ہاتھ مانگنے کے لیے فیصل آباد جانے کا ارادہ کیا۔

وہ دونوں دوپہر کے کھانے پر سمدھیانہ میں پہنچ گئے۔ روٹی ٹکر کھا کر انہوں نے دست سوال دراز کیا۔

انکی بات سن کر حسنہ کی ماں کے چہرے پر ناگواری چھاگئی ۔ جب کہ حسنہ کا والد سوچ میں ڈوب گیا۔ رفیق کے والدین مایوس واپس آ گئے۔

"ہم صلاح کر کے آپ کو بتادیں گے۔ میں خط لکھ دونگا۔"

حسنہ کے والد نے جاتے ہوئے ان سے کہا۔

"بیٹی کا معاملہ ہے احتیاط سے چلنا پڑتا ہے"

حسنہ کے والد نے اس کی والدہ سے کہا۔

"بس ایک بیٹی دے دی ہے بہت ہے دوسری نہیں دونگی۔"

"ٹھیک ہے جیسے تری مرضی میں خط میں انکار لکھ دونگا"۔

عبداللہ خان نے خط میں انکار لکھ بھیجا۔

عظیم خان خط پڑھ کر رفیق سے مشورہ کرنے لگا
باپ کو اداس دیکھ کر رفیق نے تسلی دی اور کہا
"میں اور حسنہ جائیں گے اور ان سے بات کریں گے "
جیسے پُت (بیٹا) تری مرضی۔
ایک ہفتے بعد رفیق اور حسنہ جمیل اور محمودہ کے رشتے کے لیے حسنہ کے والدین کے گھر انیتس چک پہنچے۔
بیٹی اور داماد کو دیکھ کر حسنہ کی ماں ام کلثوم کا ماتھا ٹھنکا۔
کھا پی کے فارغ ہوئے تو رفیق نے رشتے کی بات چھیڑ دی۔ اس کا سسر عبد اللہ خان سوچ میں پڑ گیا۔
اس نے ام کلثوم کو سمجھایا کہ بیٹی کے لیے خاندانی رشتہ ملنا مشکل ہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد رشتے دار بکھر گئے ہیں۔ محمودہ کی عمر نکل رہی ہے۔ جمیل شریف لڑکا ہے -اس میں کوئی بری عادت نہیں ہے - پھر حسنہ ہے وہاں وہ چھوٹی بہن کا خیال بھی رکھے گی۔
شوہر کے سمجھانے بجھانے پر ام کلثوم چارو ناچار مان گئی۔
حسنہ اور رفیق خوش خوش ڈبہ والا کے لیے روانہ ہو گئے۔
عظیم خان اور محمد بی بی بہت خوش ہوئے -اب وہ صفیہ کے ساتھ ساتھ جمیل کی شادی کی تیاریاں بھی کرنے لگے۔
سلمی کی شادی ام کلثوم نے ایک زمیندار سے کر دی- جس کی بیوی کو سکھ اٹھا لے گئے تھے۔ سلمی کا شوہر امجد خان اچھا آدمی تھا۔ سلمی اس کے ساتھ خوش تھی۔
عظیم خان کی والدہ بیمار ہو گئی - پیٹ خراب ہوا۔ چند دن بخار رہا اور چل بسی۔ ڈبہ والا گاؤں کے قبرستان میں مہاجروں کی پہلی قبر بن گئی۔
عظیم خان کی ماں اپنے والدین، شوہر اور اجداد کی قبروں سے بہت دور ساندل بار کے علاقے میں ابدی نیند سو گئی-
عظیم خان کی جالندھر کی روٹین دوبارہ شروع ہو گئی -وہ فجر پڑھ کر قبرستان جاتا
ماں کی قبر پر پانی ڈالتا- دعا کرتا- وہ اپنی وفات تک یہ کار خیر نبھاتا رہا-

ooooooooo

صفیہ اور رشید خان کے نکاح کی تیاریاں دونوں طرف شروع ہو گئی تھی۔ صفیہ کے نکاح سے پہلے جمیل کی بارات اور ولیمہ رکھا گیا تھا۔

رشید خان پورے دو سال بعد برطانیہ سے سے ایک ماہ کی چھٹی پر وطن واپس لوٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھا - پیٹر نے اسے اضافی رقم بھی دی تھی اور تحفے تحائف بھی۔

یہ تحائف رشید خان کے گھر والوں اور ہونے والی بیوی کے لیے تھے۔ ان میں گھڑیاں اور جرسیاں تھیں۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے صفیہ کو بٹنا (ابٹن) لگا دیا گیا۔

روزانہ اسے گاؤں کی نین (نائی کی بیوی) ابٹن ملنے آتی۔ ڈھولکی بجائی جاتی - گانے گائے جاتے۔ پاکستان کو بنے تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

دوسری طرف حسنہ کے مائیکے میں محمودہ کی شادی کی تیاریاں بھی اپنے عروج پر تھی۔

عظیم خان جمیل خان کی بارات لے کر انیتس چک پہنچا- تو باراتیوں کا شاندار استقبال کیا گیا۔

حسنہ کے والد کی بہت بڑی حویلی تھی۔

بکرے کے گوشت کا سالن، تنجن، پلاؤ اور کھیر باراتیوں کے لیے تیار کیے گئے۔

ضیافت کے بعد رخصتی کی گئی - محمودہ بیاہ کر ڈبہ والا گاؤں آگئی۔ دلہن بن کر اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔

جب جمیل نے گھونگھٹ اٹھایا تو مبہوت رہ گیا۔

"تم تو بہت سندر ہو -- میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔"

محمودہ شرما کر خود میں سمٹنے لگی۔ محمودہ

سرخ رنگ کے گوٹہ

لگے شلوار قمیض میں اپسرا الگ رہی تھی - سرخ سفید رنگت دمک رہی تھی - کنوارے پن کی حیا نے اس کے رخساروں کو جگمگا رکھا تھا- جمیل نے محمودہ کو بانہوں کے گھیرے میں لے لیا-

جمیل تو محمودہ کا دیوانہ ہو گیا۔ محمودہ کی بے قراریوں کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں گم رہتے - نئی نئی شادی کا خمار تھا۔

محمد بی بی کی والدہ، والد اور بھائی، بھابھیاں شادی میں شرکت کے لیے فیصل آباد سے آئے ہوئے تھے۔

قدسیہ بیگم رشتہ داروں سے اپنی حویلی کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھی۔ انہیں شروع سے ہی شیخیاں بھگارنے کی عادت تھی۔ وہ سب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی

اگلے دن ولیمہ تھا۔ پورے گاؤں کی دعوت رکھی گئی۔

چوہدری اللہ وسایا لنگڑیال کو بھی شادی میں بلایا گیا۔

حسنہ کے والدین اور رشتہ دار بھی شریک ہوئے۔ وہ صفیہ کی رخصتی کے بعد واپس چلے گئے۔

مقررہ دن پر بہت دھوم دھام سے رشید خان بارات لے کر آیا۔ سارے گاؤں میں عظیم خان کی بلے بلے (واہ واہ) ہو گئی۔

بہترین کھانا پکوایا گیا۔ عظیم خان نے ایک دوسرے گاؤں سے مشہور نائی کو بلایا۔ کٹے (بیل کا بچہ) کا گوشت پکوایا گیا۔ زردہ پلاؤ بنوایا گیا۔ بارات نے تین دن گاؤں میں قیام کیا اس کے بعد صفیہ رشید کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

رشید خان صفیہ کو پا کر بہت خوش تھا۔ صفیہ کی معصوم صورت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ دن عید مثال ہو گئے تھے۔ اور راتیں پُر نشاط۔

شادی کے ابتدائی ایام میں مرد اور عورت جسمانی کشش کو محبت سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ہی حال صفیہ کا بھی تھا- مرد عورت کو اپنی غرض کے لیے پیار کرتا ہے- مرد عورت کے جسمانی تعلق میں اگر مرد کے لیے لذت کا عنصر نہ ہو تو مرد کبھی عورت کی طرف نہ دیکھے- عورت جو ہمیشہ سے جذباتی ہے- وہ مرد کے جال میں پھنس کر خود کو اس کی بے دام کنیز بنا دیتی ہے - اس کی خدمت کرتی ہے - بچے پیدا کرتی ہے - مرد کی ایک محبت بھری نگاہ کی منتظر عورت، چند پیار بھرے الفاظ سے بہل جاتی ہے - فطرت نے عورت کے ساتھ ہمیشہ ناانصافی کی ہے - عورت کو مرد کو کھلونے کے طور پر عطا کیا ہے-

غیر مرد کی ہوس بھری نظر اور شوہر نما لائسنس یافتہ مرد کی ہوس کا برتن بھرتے بھرتے عورت قبر میں جا سوتی ہے لیکن اسے ملتا کچھ نہیں ہے - وہ آخر میں خالی ہاتھ، خالی دل رہ جاتی ہے - کچھ مرد تو اس قدر بے غیرت ہوتے ہیں کہ وہ عورت (بیوی) سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتے ہیں - جوانی میں یہ بیوی ان کے لیے سیکس ٹوائے ہوتی ہے - پھر بچہ پیدا کرنے کی مشین بن جاتی ہے - اور جب بچے جوان ہو جائیں تو گھر کے کسی کونے میں پڑا ہوا فالتو سامان -

رشید کے چوڑے سینے میں سر چھپائے اس کے بدن کی حدت اپنے اندر سموتے ہوئے صفیہ خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت تصور کر رہی تھی۔

رشید کے پیار کے جنگل میں صفیہ کا تن مور بن کر ناچ رہا تھا

رشید اسے دیکھ مسکراتا رہتا اور وہ شرماتی رہتی۔

صفیہ کے گاؤں میں بجلی اور گیس نہیں تھی۔ لاہور شہر میں رشید کے گھر میں بجلی

کی سہولت تھی۔ صفیہ لالٹین کی عادی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنی ماں کے کچے صحن سے باہر قدم نکالا تھا۔ اپنے گاؤں سے وہ پہلی دفعہ رشید کی بارات کے ساتھ رخصت ہو کر آئی تھی۔ رشید کا مکان ہندو کی چھوڑی ہوئی حویلی تھی۔ شہر کے بچوں بیچ دو منزلہ پکا مکان جو کہ دس مرلہ پر مشتمل تھا۔ اس مکان کی دیوڑھی صحن میں کھلتی۔ پانی کے لیے ہینڈ پمپ صحن میں لگا ہوا تھا۔ نیچے اوپر کل ملا کر آٹھ کمرے تھے ایک باورچی خانہ تھا۔ صحن کے ایک کونے میں ہی غسل خانہ اور لیٹرین بنی ہوئی تھی۔

مکان سے ملحقہ گلی پکی تھی۔ دونوں اطراف میں نالیاں تھیں۔ یہ گلی سڑک پر جا کر کھلتی۔ سڑک پر دکانیں تھیں۔ جہاں سے ہر چیز مل جاتی اور ذرا آگے چوارا ہے میں ٹانگوں کا اڈا تھا۔ یہ ٹانگے شہر کے ہر علاقے میں جاتے تھے۔ رشید صفیہ کو لے کر رات کے وقت چھت پر چڑھتا تو لاہور شہر کی چمکتی ہوئی بتیاں دیکھ کر صفیہ بہت حیران ہوتی – اندھیرے میں ڈوبا اس کا گاؤں اسے یاد آتا۔ رشید نے صفیہ کو شاہی قلعہ اور چڑیا گھر دکھانے کا سوچا۔ اس نے اپنی ماں اور صفیہ کی ساس کو اپنا پروگرام بتایا تو وہ جل کر رہ گئی مگر بہت چالاک عورت تھی مسکرا کر کہنے لگی – ”ہاں ہاں کیوں نہیں لیکن اکیلے مت جانا چھوٹے بہن، بھائیوں کو ساتھ لے جانا کہیں گم نہ ہو جاؤ“ اگلی صبح سب تیار ہوئے تو رشید کے والدین بھی تیار ہو گئے – گھر میں گلی سے نکل کر سڑک پر آئے اور سالم ٹانگہ کروا کر شاہی قلعہ جا پہنچے۔

شاہی قلعہ کی بلند بالا عمارت دیکھ کر صفیہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مینار پاکستان کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ اوپری منزل پر پہنچی تو بہت خوش ہوئی۔

چڑیا گھر میں بھانت بھانت کے جانور اسے بہت اچھے لگے۔ گاؤں میں تو بھینس، گائے، بکری، کتے، مرغی اور بلی کے علاوہ اس نے صرف پرندے دیکھے تھے۔ کوے، فاختہ، چڑیا وغیرہ

افریقہ کے خونخوار جانور، رنگ برنگے پرندے، سانپ گھر، ہاتھی، شیر، گینڈا، دریائی گھوڑا، زرافہ، زیبرا وغیرہ اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔ شام کو سب تھکے ہارے گھر واپس پہنچے -سب سیر سے بہت لطف اندوز ہوئے تھے۔
رومانوی دن جلدی سے گزر گئے۔ اچھاوقت ہمیشہ تیز چلتاہے۔ ایک دوجے سے پیار کشید کرتے دونوں بہت خوش تھے۔ رشید کی بانہیں صفیہ کے نازک وجود کو پناہ گاہ لگتی۔ رشید خان سے زیادہ اچھامرد اس نے کبھی دیکھانہ تھا۔ شرمائی لجائی دلہن کو چھوڑ کے جانے کو رشید خان دل رضامند نہیں تھا۔ لیکن اسے جاناپڑا۔ اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ صفیہ سارادن رشید کی کمی محسوس کرتی۔ بولائی بولائی پھرتی۔ رات کاٹے نہ کٹتی۔ رشید بہت یاد آتا۔ ساس نے آہستہ آہستہ گھر کا ساراکام صفیہ پر لاد دیا۔ دو تین ماہ کے بعد رشید خان کا خط آجاتا تو خیریت معلوم ہو جاتی۔ صفیہ بے قراری سے رشید کی منتظر تھی۔
وہ اپنے سسرال والوں کی خدمت دل سے کرتی -یہ ہی اس کے والدین کی تربیت تھی- مگر اس کی مکار ساس اپنی چالیں چلنے سے
باز نہ آتی -رشید پیسے بھیجتاتو وہ بہو کو ایک روپے تک نہ دیتی -رشید سے کہتی کہ خرچہ دیتی ہوں -اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ صفیہ برطانیہ نہ جاسکے -مگر رشید کے مجبور کرنے پر صفیہ کے سسر نے اس کا پاسپورٹ بننے دے دیا۔

ooooooooo

محمد بی بی، عظیم خان، رفیق، حسنہ، پروین، جمیل اور محمودہ قدسیہ بیگم کی دعوت پر فیصل آباد پہنچے۔ اسٹیشن سے ٹانگہ کرواکر وہ قدسیہ کے گھر پہنچے۔ حویلی کے آہنی گیٹ پر دربان بیٹھا ہوا تھا۔
صدر دروازے سے وہ ہوتے ہوئے صحن میں آپہنچے۔ انکے استقبال کے لیے قدسیہ بیگم سب اہل خانہ کے ہمراہ صحن میں کھڑی تھیں۔
مصافحے اور معانقے کے بعد ان کی خاطر تواضع مالٹوں کے جوس سے کی گئی -- وہ دھوپ میں بیٹھ گئے -سرما کی خوشگوار دھوپ اور قدسیہ بیگم کی شاندار حویلی کاماحول انہیں بہت بھلا محسوس ہوتا تھا-
عظیم خان ساس کے اعلی معیار زندگی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ بے چارہ محمد بی ی تو انکی اولاد لگتی نہیں ہے -یہ نہیں ہے کہ وہ خوبصورت نہیں ہے -بس بچاری کو خدمات نے لیا ہوا ہے -کاش میں بھی اسے ایسا آرام دے سکتا۔

ملازمین قدسیہ بی بی کے احکامات بھاگ بھاگ کر بجالاتے -وہ جنبش کے اشارے سے گفتگو کرتی -اسلم خان اپنے سادہ انداز میں سب سے گفتگو کر رہے تھے -اکبر ماں کی طرح ڈینگیں بھگار رہا تھا- عظیم خان کے بچے مہمانوں کی طرح باتکلف بیٹھے تھے۔

صحن کے بعد سہ درے، دالان، توشہ خانہ اور کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ چھتیں چھوٹے ،بڑے تراشیدہ شہتیروں پر مشتمل تھیں۔ دروازے شیشم کی مضبوط لکڑی سے بنے ہوئے تھے -عالیشان حویلی اور قدسیہ بیگم کا کروفر دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ دوسری صبح بازار جانے کا پروگرام بنا- کپڑے کی خریداری کی گئی۔ فیصل آباد کے بازار سے انہوں نے سب وہ اشیاء خریدی -جو گاؤں میں نہیں ملتی تھی۔

قدسیہ بیگم نے محمد بی بی کو ذراسی دیر کے لیے بھی پاس بٹھانا گوارانہ کیا-اسلم خان خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔اس نے بیٹی کے پاس بیٹھ کر اپنی مرحومہ ماں کی باتیں شروع کر دی- محمد بی بی بچاری خوش ہو گئی۔

چار روزہ قیام میں قدسیہ نے ان کی اعلی خاطر تواضع کی۔ جاتے ہوئے قیمتی تحائف ساتھ کیے۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔

قدسیہ بیگم نے آس پڑوس، گلی، محلے میں خود کو نوابی خاندان کے افراد مشہور کر رکھا تھا۔ اردگرد رہنے والوں نے انہیں سچ مچ نواب سمجھ لیا تھا۔ ملاقات کے لیے آنے والی ہمسائیوں کو وہ اپنے اعلی خاندان کے حسب نسب کے قصے سناتی۔ وہ خود کو رام پور کے پٹھان نواب خاندان سے جاملاتی۔ قدسیہ بیگم نے جو خواب عمر بھر دیکھے تھے -ان کی تکمیل ہندوستان کی تقسیم کے بعد ملی اور خوب ملی۔ قدسیہ بیگم کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ وہ ناز و ادا سے چلتی۔ ٹھہر ٹھہر کے اردو زبان بولتی اور اشعار پڑھتی۔ پنجابی زبان بولنے والے مقامی اس کے لب و لہجے سے متاثر ہو جاتے تھے۔

oooooooooo

آہستہ آہستہ محمودہ کی تنک مزاجی گھر بھر پر واضح ہونے لگی۔ محمد بی بی نظر انداز کرنے لگی کہ کہیں گھر کا ماحول خراب نہ ہو جائے۔

حسنہ بھی بہن کو سمجھاتی رہتی کہ محمودہ امید سے ہو گئی -اب تو سارے گھر والے محمودہ کے نخرے اٹھانے لگے۔ محمد بی بی نے محمودہ کو ہاتھ کا چھالا بنالیا۔ محمودہ نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا بچے کا نام قاسم رکھا گیا۔

قاسم کی پیدائش کے بعد محمودہ مزید چڑچڑی ہو گئی۔

محمودہ کی بد مزاجی جب نا قابل برداشت ہو گئی تو عظیم خان نے گاؤں میں ایک مکان خریدا۔ اس مکان میں اس نے جمیل، محمودہ اور ننھے قاسم کو منتقل کر دیا۔ یہ مکان اس دلجیت کور کا تھا۔ جو بٹوارے کے بعد ہندوستان چلی گئی تھی۔ مگر بلی سائیں تو گاؤں میں ہی تھا۔ وہ عادتاً دودھ پینے

محمودہ کے گھر آیا تو محمودہ نے اس کے وہ لتے لیے کہ بچارہ ڈر کر بھاگ گیا۔ دوبارہ کبھی بلی سائیں نے محمودہ کے گھر کارخ نہیں کیا-

الگ گھر میں جا کر محمودہ کو پھوہڑ پن اور سستی بھی کُھل کر سامنے آگئی-اب اسکی بڑی بہن حسنہ موجود نہیں تھی جو اسے کور کر لیتی تھی-وہ بیماری کا بہانہ کر کے ساس کے گھر سے سالن منگوا لیتی- کبھی من ہو تا تو پکا لیتی-بچے بھی گندے مندے پھرتے رہتے-اگر اس کے گھر کوئی مہمان آتا تو اسے چائے تک نصیب نہ ہوتی-رخصتی کے وقت دو انڈے ڈربے سے نکال کر محمودہ مہمان کو تھمادیتی اور کہتی گھر جا کر ابال کر کھالینا- محمودہ کی کوئی ایک عادت بھی حسنہ سے نہیں ملتی تھی-زبان کی بھی وہ بہت تیز تھی-اس کا شوہر جمیل مٹی کا مادھو تھا-بیوی کا دیوانہ تھا- اسے محمودہ کے نشیلے بدن اور خوبصورت چہرے نے مرعوب کر رکھا تھا۔

ooooooooooo

دسواں باب

پردیس

صفیہ کا ویزہ لگ گیا لیکن ابھی اس کے جانے میں ایک سال کا عرصہ تھا۔

عظیم خان نے دوسرے پوتے کے عقیقے کی دعوت رکھی۔

صفیہ سسر اور ساس کے ساتھ ڈبہ والا قاسم کے عقیقہ میں گئی۔

ڈبہ والا اسٹیشن کسی حسین دوشیزہ کی طرح ناز سے کھڑا تھا۔ اپنے حسن پر نازاں - اپنے گاؤں کی مٹی پر قدم رکھتے ہی صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچی پگڈنڈی، راستے کے دائیں بائیں لہلہاتے کھیت، بہتی ہوئی نہر، جھومتے درخت اور تازہ چلتی ہوئی ہوا - سب نے صفیہ کو خوش آمدید کہا۔ گلے سے لگایا۔ صفیہ گھر والوں سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

گاؤں کی کچی سڑکیں دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ جب گڈا گزرتا تو مٹی کا ایک بگولہ اڑتا اور اطراف کو دھندلا کر دیتا۔ چند سیکنڈ کے بعد مٹی بیٹھ جاتی۔ یہ نظارہ آج صفیہ کو بہت اچھا لگ رہا تھا- وہ دروازے کی اوٹ سے لگی خاموش کھڑی تھی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ -پتا نہیں- دوبارہ کب آونگی۔ کب اپنوں سے ملوں گی۔ کچھ خبر نہیں ہے۔

اسے اداس دیکھ کر محمد بی بی کی آنکھ بھر آئی۔ اس نے صفیہ کو پچکارا

"صفیہ دنیارانیے میرے پاس آ۔"

صفیہ ماں کے آغوش میں چھپ گئی- دونوں کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

دور چلی جائے گی پردیس میری دھی- محمد بی بی کے دل سے ہوک اٹھی۔

صفیہ کو بھی اداسی ہو رہی تھی۔

اتنے میں عظیم خان کمرے میں داخل ہوا ماں بیٹی کو روتا دیکھ کر وہ خاموشی سے دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا اور بیٹی کو دلاسہ دینے لگا۔

"دھیے رشید اچھا آدمی ہے۔ تیرا خیال رکھے گا۔ تجھے خوش رکھے گا- فکر نہ کر- ہماری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔"

صفیہ کا دل ہلکا ہو گیا- تھوڑی دیر بعد باہر جا کر حسنہ کے ساتھ روٹیاں پکانے لگی - حسنہ اسے دھیرے دھیرے شادی شدہ زندگی کی اونچ نیچ سمجھانے لگی۔

صفیہ جتنے دن گاؤں میں رہی - اس نے پرانی یادیں تازہ کی۔ گاؤں کی سوغاتیں کھائی۔ سہیلیوں کو لاہور کے قصے سنائے۔ چند دن رہ کر وہ لوگ واپس آ گئے۔ صفیہ کی شادی محمودہ کے ساتھ ہوئی تھی - لیکن اس کی گود خالی تھی۔ وقت کاٹے نہ کٹتا۔ رشید خان سال بعد آیا۔ رشید خان کا باپ اسے لینے ائیر پورٹ چلا گیا۔ صفیہ کی خوشی دیدنی تھی۔ سال کے بچھڑے ملے - توٹوٹ کر ملے۔ جی بھر کے پیار کیا۔ دکھ سکھ کہے۔

رشید خان سب کے لیے تحائف لایا سوائے صفیہ کے۔

صفیہ بہت دُکھی ہوئی مگر چپ رہی۔ "تیرے لیے کچھ نہیں لایا۔ تجھے لینے جو آیا ہوں۔ وہاں جا کر جو دل کرے اپنی مرضی سے لے لینا"۔

یہ کہہ کر رشید نے صفیہ کو آغوش میں بھر لیا اور اس کی قمیض اتارنے لگا۔ صفیہ نے مرد کی طلب کو محبت سمجھ لیا- اور خوشی خوشی اپنی کھوکھ اس کی وحشت سے بھر لی۔

والدین اور بہن بھائیوں کو رشید خان نے بہت خوش کیا- انکے لاڈ اٹھائے - ان کی مستقبل کی فرمائشیں پوچھی- چند دن بعد وہ دونوں الوداعی ملاقات کرنے ڈبہ والا گئے۔ رشید صفیہ کے گھر والوں کے لیے تحفے لایا تھا- سب بہت خوش ہوئے۔ اپنے سسر کے لیے گھڑی، ساس کے لیے جرسی، صفیہ کی دادی کے لیے شال، رفیق کے لیے پرفیوم، جمیل کے لیے ائیر گن۔ صفیہ کی بہن کے لیے میک اپ۔ جمیل کو شکار کا شوق تھا- وہ گُگی (فاختہ) شکار کرتا تھا۔ سب تحائف لے کر بہت خوش تھے۔ رشید خان ایک ماہ پاکستان میں رہا۔ صفیہ کو محبت کے نام پر دن رات رگیدنے کے بعد رشید خان صفیہ کو لے کر برطانیہ چلا گیا۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ

مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

اتنا صبر، شعور اور فہم پاکستانی مردوں میں کہاں۔ یہ تو ہر معاملے میں زبردستی کے قائل ہیں۔ عورت انکے نزدیک ایک حیوان ہے جو جنسی ضرورت اور افزائش نسل کے لیے پیدا کی گئی ہے - اس لیے اسے یہ ہی دو کام زیب دیتے

ہیں۔ اور اس سے یہ ہی دوکان لینے چاہیے - عقل، شعور، فہم، تعلیم کی عورت کو ضرورت نہیں ہے۔ یہ صرف مرد کے لیے ہیں۔

روتی دھوتی صفیہ ہوائی جہاز سے انگلستان اڑان بھر گئی۔

برقعے میں ملبوس صفیہ نے ائیر پورٹ سے باہر قدم رکھا - تو برمنگھم شہر کی روشنیاں اور کہر میں لپٹا دن دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ٹیکسی سے شہر کے کوچہ وبازار دیکھ کر وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتی رہی۔

لاہور بھی کہیں پس منظر میں چلا گیا اور ڈبہ والا تو بہت پیچھے رہ گیا۔

رشید خان ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ دو کمرے، ایک کچن، ایک باتھ روم۔

صفیہ نے پہلی دفعہ کثیر المنزلہ عمارات دیکھی تھی۔

یہ فلیٹ اس کے لیے محل سے کم نہیں تھا۔ وہ ضروریات زندگی کی جدید چیزیں دیکھ کر حیران تھی - ”آرام سے سب کچھ دیکھ لینا پہلے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔"

رشید خان نے صفیہ سے کہا۔

صفیہ نے برقع اتارا۔

رشید بازار سے اشیائے خوردونوش لے آیا۔

صفیہ کو اس نے چولہا جلانا سکھایا۔ صفیہ نے کھانا تیار کیا۔ کھانا بہت لذیذ بنا تھا۔ رشید خان خاموشی سے کھاتا رہا۔

اور اٹھتے ہوئے بولا

"یہ برتن ابھی دھو کر رکھ دو اور کچن بھی صاف کر لو"

"جی"

صفیہ نے زندگی میں پہلی دفعہ لمبا سفر کیا تھا - وہ بہت تھک چکی تھی - اس کے باوجود وہ خاموشی سے کام کرتی رہی۔

برطانیہ کا رشید خان پاکستان کے رشید سے بالکل مختلف تھا۔

جب وہ کمرے میں آئی تو رشید خان سو چکا تھا۔

رشید خان کا لہجہ، انداز اور برتاؤ سب بدل گیا تھا۔

وہ خود کو انگریز آقا اور صفیہ کو ہندوستانی غلام سمجھنے لگا تھا۔

صفیہ فوم کے گدے پر پہلی دفعہ سوئی تھی-اسے بہت اچھی نیند آئی۔
ساری تھکاوٹ اتر گئی۔
صبح آنکھ کھلی تو دیر تک عجیب سے احساس کے گھیرے میں رہی- بیس گھنٹے کے طویل سفر کے بعد اس کا ملک بدل چکا تھا، شہر، موسم، طرز معاشرت سب نئے تھے-شوہر سمیت-
"ناشتہ بنادو پہلے -یہ سوچ بچار بعد میں کر لینا-سارادن تم ویلی ہو مجھے کام کرنا ہے۔"
رشید خان نے صفیہ سے کہا-
وہ اٹھ کر باتھ روم گئی-منہ دھو کر ناشتہ بنانے لگی-خستہ پراٹھے، رات کا سالن اور چائے-رشید خان طمانیت سے کھانے لگا۔
"میں جارہا ہوں-بیل بجے تو دروازہ مت کھولنا۔"
رشید خان صفیہ کو نصیحت کر کے چلا گیا-رشید خان مغرب کے بعد آیا۔ صفیہ نے گھر کا کام دو گھنٹے میں ختم کر لیا۔ پھر اونگھتی رہی اور بور ہوتی رہی۔
رشید خان نے آتے ہی کھانا مانگا- کھانا کھا کر وہ بستر پر لیٹ گیا- تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ صفیہ کو بھنبوڑنے لگا- اپنی تھکاوٹ اتار کر وہ سو گیا- صفیہ ششدر سی رشید کے رویے پر غور کرنے لگی- یہ لگی بندھی روٹین بن گئی۔
صفیہ کو رشید خان کا رویہ کاٹنے لگا۔
رشید خان کے لہجے کی حقارت اسے بہت چبھتی۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔
مصروفیت کے لیے اس نے سلائیاں، اون کے گولے منگوا لیے۔ وہ اپنی قسمت پر صبر کرنے لگی۔ شکوے کی اسے عادت نہیں تھی۔ وہ کام سے فارغ ہو کر رشید خان کا سویٹر بنتی رہتی۔
جب سویٹر تیار ہو گیا تو رشید خان نے اسے پہنا۔ سویٹر دیدہ زیب اور خوبصورت تھا-ڈیزائن بھی صفیہ نے عمدگی سے چنا تھا لیکن رشید خان ان مردوں میں سے نہیں تھا-جو بیوی کی تعریف کر دیں،-وہ ان مردوں میں سے تھا-جو بیوی کو اہمیت دینا اپنی مردانگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ بیوی کو کھلایا، پہنایا، ملازم بنایا، اولاد پیدا کی اور بس۔

وہ دکان پر پہنچا اور کوٹ اتار کر کام کرنے لگا۔ جب پیٹر کی نگاہ اس کے سوئٹر پر پڑی تو بے ساختہ تعریفی کلمات پیٹر کے منہ سے نکلے۔

رشید خان بہت خوش ہوا۔ اس نے گھر واپسی پر اون خریدی اور صفیہ کو ایک اور سوئیٹر بننے کا کہا۔

صفیہ نے ایک ماہ لگا کر سوئٹر تیار کر لیا۔

رشید خان نے پیٹر سے گھر ملاقات کا وقت لے لیا۔ دونوں شام کو پیٹر کے گھر چلے گئے۔ برقی گھنٹی کی آواز سن کر پیٹر نے دروازہ کھولا- اس کے کپڑے گیلے تھے - وہ کام میں مصروف تھا۔ وہ انہیں اندر لے آیا۔ اس نے انہیں لیونگ روم میں بٹھا دیا- صفیہ کی جھجک اور برقع دیکھ کر اس نے صفیہ کو اندر اپنی بیوی لارا کے پاس بیڈ روم میں بھیج دیا۔

پیٹر سوئیٹر لے کے بہت خوش ہوا۔

پیٹر کی بیوی نے صفیہ کو برقع اتارنے کا اشارہ کیا۔

صفیہ برقع اتار کر بیٹھ گئی۔ پیٹر کی بیوی نے اشاروں سے صفیہ کی خوبصورتی کی تعریف کی-"

یو آر ویری پریٹی مائے ڈیئر"-

پیٹر کی بیوی بولی۔

"شکریہ"

صفیہ شرمانے لگی۔

پھر اس نے پاکستان سے متعلق سوال پوچھے۔

صفیہ کو انگریزی نہیں آتی تھی- وہ مسکراتی رہی۔

پیٹر کی بیوی اشاروں سے بات سمجھاتی رہی۔

پیٹر کی بیوی کی طبعیت خراب تھی - اس کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر نے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا تھا۔ اسی لیے گھر کا کام بھی پیٹر کی ذمہ داری بن گیا تھا۔ رشید خان نے گھر کے حالات دیکھ کر پیٹر کو صفیہ کی خدمات سے مستفید ہونے کا کہا۔

پیٹر بہت خوش ہوا۔

رشید نے پیٹر سے کہا۔"ڈونٹ وری۔صفیہ صبح سات بجے پہنچ جائے گی۔ناشتہ بنائے گی۔بچے تیار کرے گی اور گھر کا کام کرے گی۔"

یہ طے کر کے رشید خان صفیہ کو لے کر وہاں سے گھر واپس آ گیا۔

صفیہ کو رشید خان نے صبح پانچ بجے جگا دیا۔اس نے صفیہ کو صبح سات بجے پیٹر کے گھر چھوڑا۔واپسی کا راستہ سمجھایا اور کام سے فارغ ہو کر گھر واپس آنے کا کہا۔

صفیہ نے برقع اتارا۔بڑی چادر میں خود کو لپیٹا۔چہرہ ڈھانپ کے چائے بنانے لگی۔

پیٹر کو چائے دے کر وہ بچوں کو ناشتہ کروانے لگی۔اس نے بچوں کو یونیفارم پہنا کر اسکول کے لیے تیار کیا۔اس نے پیٹر کی بیوی لارا کے لیے سوپ تیار کیا۔بیکنگ سے وہ ناواقف تھی۔اس نے گھر بھر کے گندے برتن اور کپڑے دھوئے۔

صفائی کی۔اور ماریا سے اجازت لے کے گھر لوٹ آئی۔وہ گھر پہنچی تو ایک بج رہا تھا۔اس نے صوفے پر بیٹھ کر پانی پیا۔دل عجیب سا اداس ہو رہا تھا۔اداسی کس بات کی تھی۔وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔کسی کی مدد کرنے کا بہت ثواب ہوتا ہے۔اس نے دل کو سمجھایا۔جسمانی تھکن سے زیادہ دل بوجھل ہو رہا تھا۔کوئی بات نہیں ہے۔چند دنوں کی بات ہے وہ فارغ ہو جائے گی تو اپنا گھر خود سنبھالے گی۔اس نے دل میں سوچا۔

صفیہ اٹھ کر اپنے گھر کے کام کرنے لگی۔جب سارا کام ختم ہوا تو چار بج گئے تھے۔اس نے ظہر اور عصر کی نماز اکٹھی ادا کی اور بستر پر لیٹ گئی اس کی آنکھ لگ گئی۔

رشید خان کے دھاڑنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔"یہ سونے کا کون سا وقت ہے۔نحوست پھیلا رہی ہو تم مغرب کا وقت ہو رہا ہے"۔

"وہ میں تھک گئی تھی آنکھ لگ گئی تھی۔"

صفیہ نے جواباً کہا۔صفیہ نے جوتا پہنا اور باتھ روم کا رخ کیا۔

"ان پڑھ، جاہل عورت، ناشکری۔انگلینڈ میں بیٹھ کر بھی خوش نہیں ہے۔ڈبہ والا میں ہوتی۔کسی دھوتی والے دہقان سے اس کی شادی ہو جاتی۔وہاں مٹی پھانکتی تو بالکل ٹھیک رہتی۔یہاں عیش کر رہی ہے۔پھر بھی رونی شکل ہے۔یہ عورتیں ہوتی ہی منحوس ہیں۔

وہ خود سے بولا۔"

صفیہ نے نماز پڑھ کر کھانا میز پر چنا۔ کھانا کھا کر رشید خان تو کمرے میں چلا گیا۔ صفیہ نے برتن دھو کر کچن سمیٹا۔ اور سونے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔ رشید خان نے اس کی طرف کروٹ لی تو صفیہ نے دوسری طرف رخ کر لیا رشید خان کی جسمانی ضرورت پوری کرنے کا آج اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا- مرد کی تھکن کا بوجھ عورت کی کھوکھ اٹھاتی ہے اور عورت کی تھکن ؟

-اسکی تھکن کا کیا حل ہے ؟

وہ نہیں جانتی تھی اپنی تھکن کا حل۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وہ سوچتی رہی۔ کڑھتی رہی اور اس کی آنکھ لگ گئی

رشید خان کو بھی اس کے سونے پر غصہ تھا اس لیے وہ بھی سو گیا۔

پیٹر کے گھر کا کام صفیہ کی روٹین میں شامل ہو چکا تھا۔ رشید خان کے جانے کے بعد چند گھنٹے وہ آرام کرتی تھی۔ یہ آرام نئی ذمہ داری کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔ صفیہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکنے لگی- اس کا بدن ٹوٹتا رہتا تھا۔

اس کا بدن ٹوٹتا رہتا تھا۔

دل بوجھل رہتا۔ تنہائی اسے کاٹتی رہتی۔ اسے برمنگھم جیل لگتا۔ ایسا جیل جس میں اسے عمر قید کی سزا بھگتنے کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ برطانیہ کا برقی قمقموں سے سجا ہوا ملک اسے اندھا کنواں لگتا- جس میں گرا ہوا اس کا وجود حقیر، بے وقعت اور بے یارو مددگار تھا- کبھی کبھی رشید خان اس سے خیریت نامہ لکھوا کر ڈبہ والا پوسٹ کر دیتا- -اس خط کے ساتھ صفیہ اور رشید خان کی مسکراتی ہوئی تصاویر صفیہ کے اہل خانہ کو باور کروانے کے لیے سند تھی کہ وہ بہت خوش حال زندگی گزار رہی ہے-

برطانیہ کا موسم گرما بھی اسے اچھا نہیں لگتا۔ پنجاب کی حبس زدہ فضا سے جان چھوٹنے پر بھی وہ خوش نہیں تھی- رشید خان سے اسے کسی ہمدردی کی امید نہیں تھی۔ رشید خان اس کا موازنہ انگریز عورتوں سے کرتا رہتا تھا جو کہ رشید خان کے خیال میں پڑھی لکھی، عقلمند، محنتی اور فعال تھی جب کہ صفیہ گنوار، سست، کاہل اور سڑیل تھی۔ رشید خان نے آج تک اس سے محبت کے دو بول نہیں بولے تھے۔

اس کی خاموشی اور صبر کو وہ سڑیل پن سے تعبیر کرتا تھا۔

زندگی رواں دواں تھی کہ پیٹر کی بیوی نے صحت مند لڑکے کو جنم دیا۔

صفیہ نے پیٹر کی بیوی کے لیے پاکستانی مقوی غذا (پنجیری) تیار کی جو کہ زچہ کو کھلائی جاتی ہے۔اس کی خدمات سے پیٹر اور لارا بہت خوش ہوئے۔ایک ماہ بعد صفیہ کو کام سے فارغ کر دیا گیا- وہ بہت خوش ہوئی۔

خوش تو رشید خان بھی بہت تھا۔ اسے پیٹر نے بونس کی مد میں بھاری رقم دی تھی۔ صفیہ کی خدمات کا اتنا صلہ ملے گا۔رشید خان کو امید نہیں تھی۔اس نے رقم والی بات صفیہ کو نہیں بتائی۔

برطانیہ کا سرد موسم صفیہ کو بالکل پسند نہیں تھا- دھوپ بہت کم نکلتی تھی۔گھر سے باہر جاتے ہوئے اضافی گرم کپڑے پہننے پڑتے تھے۔

لیکن چونکہ باہر جانے سے وقتی طور پر صفیہ کی جان چھوٹ گئی تھی اور

صفیہ کے آرام کے دن لوٹ آئے- وہ بہت خوش تھی۔لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

برطانیہ کا سرد موسم کسی بے وفا محبوب جیسا تھا- دن بھر دھوپ نہ نکلتی۔شام ہوتے ہی سردی بڑھ جاتی اور رات رات تو سارے ماحول کو منجمد کر دیتی تھی- برف کی تہہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی۔ جن کے پاس گاڑیاں تھیں- وہ گاڑیاں صاف کرتے۔ انجن گرم کرتے- پھر کام پر جاتے۔رشید تو دکان پر پیدل جاتا تھا۔صفیہ بھی گھر سے باہر پیدل جاتی تھی۔گھر کے لیے اشیائے خوردونوش خریدنا اس کی ذمہ داری تھی۔جونہی برف باری رکتی- وہ لمبا سا کوٹ پہنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی- قریبی مارکیٹ تک جاتی۔ اور سودا سلف خریدتی۔ ایک حیدر نامی انڈین مسلمان کا گھر راستے میں تھا- وہ اکثر صفیہ کو دیکھتا تھا۔اس کی بیوی مر چکی تھی۔بچارہ اکیلا رہتا تھا۔صفیہ اسے اچھی لگتی تھی۔خاموش، اداس، تنہا۔

اس نے صفیہ کا تعاقب کر کے اس کے گھر کا پتا معلوم کر لیا اور صفیہ کے شوہر رشید سے بھی دعا سلام کر لی۔

صفیہ اپنے آپ میں مگن کچھ بھی محسوس نہیں کر پائی۔ایک دن صفیہ آٹے کا تھیلا اٹھائے بمشکل چل رہی تھی کہ حیدر کی نظر اس پر پڑی اس نے آگے بڑھ کر صفیہ سے تھیلا لے لیا اور اسے گھر تک چھوڑ آیا۔صفیہ شکریہ کہہ کر اندر چلی گئی۔حیدر گاہے بگاہے صفیہ کا راستہ روکنے لگا۔ اس نے صفیہ سے دوستی کی بہت کوشش کی اور صفیہ کے صاف انکار پر بھی پیچھے نہ ہٹا۔اس نے اپنی کوشش جاری رکھی- صفیہ اس کے بارے میں تنہائی میں سوچتی- دل چاہتا اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لے لیکن دماغ رشید خان سے ڈرا دیتا- وہ فطرتاً بزدل تھی- چاہنے کے باوجود

خوف کے خول سے باہر نہیں نکل سکی - پھر حیدر کچھ دن بعد دلی چلا گیا۔ وہاں اس کی ماں نے اس کی شادی کر دی۔ حیدر بر طانیہ واپس آ گیا۔ چند ماہ بعد اس کی بیوی زیبا بھی پہنچ گئی۔ ایک دن دونوں میاں بیوی گھر سے باہر نکلے تو انکی نظر سڑک سے گزرتی ہوئی صفیہ پر پڑی۔ صفیہ نے بھی ان کو دیکھا۔ زیبا نے بھاری کامدانی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ حیدر اسے میٹھی نظروں سے تک رہا تھا۔ صفیہ کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ کیا؟ وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی۔

صفیہ کو اپنا گاؤں بہت یاد آتا۔ دھوپ میں گنے، چھلیاں، ساگ کھانے کا مزہ ولایت میں کہاں مل سکتا تھا۔ کب جاؤنگی گاؤں؟ کب ملوں گی سب سے؟ کب اپنے گاؤں کی مٹی پر چلوں گی؟ کھیتوں میں سیر کروں گی؟ وہ سوچتی۔ خود سے پوچھتی

رشید خان سے سوال کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی - جواب جو معلوم تھا۔

رشید خان نماز جمعہ ادا کرنے اسلامک سنٹر جایا کرتا تھا - وہاں اس کی ملاقات پاکستانی کمیونٹی سے ہو جاتی تھی۔ ان میں سے ہی ایک حاجی شوکت بٹ بھی تھے۔ نماز کے بعد وہ اسلامک سنٹر کے منتظم سے ملنے کے لیے دفتر میں گیا تو حاجی شوکت وہاں موجود تھے - وہ منتظم سے اپنی پریشانی کا ذکر کر رہے تھ - ے ان کی بیوی امید سے ہے - آخری دن چل رہے ہیں - انہیں کسی بااعتماد عورت کی تلاش تھی۔ جو مشکل وقت میں ساتھ دے سکے۔ پاکستان سے کسی کو بلانا آسان نہیں تھا۔

یہ سن کر رشید خان نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دی۔

"حاجی صاحب آپ فکر نہ کریں ایک قابل اعتماد عورت ہے میری نظر میں وہ تجربہ کار بھی ہے - جب آپ حکم کریں گے - حاضر کر دونگا۔"

یہ سن کر حاجی صاحب بولے۔ "رشید میاں کل ہی لے ملوادو۔"

رشید خان اور حاجی شوکت نے آپس میں معاملات طے کر لیے۔

اسی شام حاجی شوکت رشید خان کے گھر پر آیا۔ رات کا کھانا کھایا اور صفیہ کو بیٹی بنالیا۔ اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے صفیہ کا دل موم کر لیا۔

"آج سے تم میری بیٹی ہو - یہ رشید تمہیں تنگ کرے تو مجھے بتانا - جس چیز کی ضرورت ہو میں حاضر ہوں مجھے ابو جان کہو۔"

صفیہ کے کان ہمدردی کے بول سننے کے لیے ترس گئے تھے۔

صفیہ حاجی شوکت سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ حاجی شوکت رشید خان سے پندرہ سال بڑا تھا۔ یہ اس کے بڑھاپے کی اولاد تھی ۔ جس کو دنیا میں لانے کے لیے اسے صفیہ کی خدمات درکار تھی۔ اس سے بڑے اس کے پانچ بچے تھے۔ پانچوں لڑکے تھے۔ اس کی بیوی کو بیٹی کی شدید خواہش تھی۔۔۔

صفیہ خوشی خوشی اس کی بیوی کی خدمت کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی بے حد خوشامدی تھے۔ وہ صفیہ کو باتوں سے راضی رکھتے۔ رشید خان کو موٹی رقم ملنے کی امید تھی۔

حاجی شوکت کے گھر کا کام صفیہ خوش دلی سے کرتی تھی۔ بچے کی ولادت کا وقت آگیا۔ حاجی شوکت کو اللہ نے چاند سی بیٹی دی۔ حاجی شوکت کی بیوی عمر رسیدگی کی وجہ سے چل بسی۔ بچی کی مکمل ذمہ داری صفیہ کے نازک کندھوں پر آگئی۔ اس کے اپنے گھر کا کام، حاجی شوکت کے گھر کا کام اور بچی کی پرورش کرتے کرتے صفیہ کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بیمار پڑ گئی۔

اس صورت حال سے حاجی شوکت بہت پریشان ہوا۔ وہ بچی لے کر پاکستان چلا گیا۔ اس نے بچی کو گھر کی خواتین کے حوالے کیا اور اپنے نکاح کی کوشش میں لگ گیا۔ ایک ماہ بعد اس کا نکاح ایک بانجھ مطلقہ سے کر دیا گیا۔

حاجی شوکت کی دوسری بیوی وحیدہ قبول صورت، تیس سالہ عورت تھی۔ چھریرا بدن تھا۔ چالاک اور تجربہ کار تھی۔ اب بچی کی ذمہ داری وحیدہ کے سر پر آگئی۔ وحیدہ کا مائیکہ مالی طور پر کمزور تھا۔ ڈھائی مرلہ کا سادہ سا مکان تھا ۔ جس میں اس کے دو بھائی اپنے وسیع کنبے کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ حاجی شوکت کا رشتہ ان سب کو بہت پسند آیا۔ وحیدہ بظاہر تو بچی کو پیار کرتی لیکن وہ اس بچی کو اپنے اور شوکت کے درمیان دیوار سمجھتی تھی۔

"اس بچی کی سب تم ہی ماں ہو ۔ بن ماں کی بچی ہے ۔ شفقت سے پالو گی تو ثواب بھی ملے گا اور میری محبت بھی ۔" سہاگ رات کو بچی وحیدہ کی جھولی میں ڈالتے ہوئے حاجی شوکت بولا ۔

وحیدہ کلس کر رہ گئی مگر منافقانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی "جیسے آپ کا حکم "۔

حاجی شوکت نے وحیدہ کو بہت شاپنگ کروائی۔ اس کے چھوٹے بے روزگار بھائی کو دکان ڈال دی۔ اسکے بوڑھے والدین سے حج کروانے کا وعدہ کیا۔ غرض یہ کہ اپنی بچی کی خاطر اس نے روپے پانی کی طرح بہایا۔ اسنے وحیدہ کی

بہت جی حضوری کی لیکن وحیدہ کائیاں عورت تھی۔ وہ صفیہ جیسی معصوم نہیں تھی - جو حاجی شوکت کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتی۔ دس دن بعد

شوکت واپس چلا گیا۔ بیٹی وحیدہ کو سونپ گیا۔ وحیدہ بچی کی پرورش کرتی رہی۔ اس دوران وحیدہ کے کاغذات بن گئے۔ ویزہ لگ گیا۔ آٹھ ماہ بعد شوکت آیا - بچی اور وحیدہ کو ساتھ برطانیہ لے گیا۔

اس دوران صفیہ نے شوکت کے بچوں کا بہت خیال رکھا۔ انکے کھانے پینے سے لے کر دیگر ضروریات تک صفیہ اور رشید ہی کام آئے۔ صفیہ روزانہ آتی - کھانا بنا کر جاتی۔ برتن دھو کر جاتی - صفائی کرتی اور کپڑے دھو کر استری کر کے دیتی - شوکت نے بھی رشید خان کی ہر ممکن مدد کی۔ روپے پیسہ دیا - وحیدہ کے ولایت آنے کے بعد صفیہ کی جان چھوٹی اور اس نے سکون کا سانس لیا۔ حاجی شوکت کو صفیہ کی خدمات کا احساس تھا۔ رشید خان اور صفیہ کے لیے حاجی شوکت نے لندن کی سیر کے لیے ٹرین کے ٹکٹ اور ہوٹل میں قیام کے لیے ریزرویشن کا بندوبست کیا۔ اس نے ان دونوں کو سیر کے لیے زبردستی بھیجا - رشید اور صفیہ دونوں ٹرین سے لندن پہنچے۔ دونوں پہلی بار ٹرین میں بیٹھے تھے۔ پاکستان کی تھکی ہاری ٹرین کا برطانیہ کی تیز ٹرین سے موازنہ دونوں کو حیران کر گیا۔ ان دونوں نے ہوٹل میں قیام بھی پہلی دفعہ ہی کیا تھا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ صبح دریائے ٹیمز کی سیر کا پروگرام بنا۔ جب وہ ٹرام سے دریائے ٹیمز کے کنارے پہنچے تو حیران وہ گئے۔

کسی نازنین کی طرح آہستہ آہستہ چلتا دریائے ٹیمز کاٹس والڈ کی پہاڑیوں سے تو شدت سے نکلتا ہے مگر لندن کے اندر داخل ہوتے ہی اسکا بہاؤ مدھم ہو جاتا ہے - یہ کسی دلربا حسینہ کی طرح تھم تھم کر رقص کرتا ہے۔ اس کا نظارہ محسور کن ہے - دریائے ٹیمز لندن شہر کے دل کی دھڑکن اور اس کا بہتا پانی جسم میں خون کی مانند ہے۔

دریا ٹیمز کے بہاؤ کا راستہ کسی بل کھاتے ہوئے سانپ جیسا ہے - دریائے ٹیمز جب لندن میں داخل ہوتا ہے تو اس کے پیچ و خم کے سبب کبھی یہ دائیں جانب مڑتا ہے تو کبھی بائیں جانب، کبھی مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف، اس کے کناروں پر سنٹرل لندن کی عمارات جن میں خوبصورت پارک، محلات، ، میوزیم، ، لندن کا خوبصورت اور پر شکوہ سینٹ پال کیتھڈرل، ٹاور برج اور لندن برج شامل ہیں۔ یہ سب پر کشش اور خوبصورت مقامات جو لندن کی پہچان ہیں۔ ٹیمز ہی کے کنارے جلوہ افروز ہیں۔

وہ دونوں دریائے ٹیمز کے کنارے بنچ پر بیٹھ کر بیچ پر کھیلتے بچوں، لطف اندوز ہوتے جوڑوں اور فیملی ٹائم گزارتے خاندانوں کو دیکھنے لگے۔

یہ نظارہ صفیہ کے لیے بہت خوش کن تھا-جب سے وہ برطانیہ آئی تھی-کام کاج کا بوجھ اس پر لاد دیا گیا تھا-زندگی کیا ہے-وہ بھول گئی تھی۔

سارا دن دریا کنارے گزارنے کے بعد

دریا ٹیمز سے وہ دونوں ٹرافلگر پہنچے۔

پکاڈلی سے ٹہلتے ہوئے ٹرافلگر اسکوائر کی جانب بڑھے۔ انہوں نے بہت ساری تصاویر بنوائی-رنگ برنگے کھانے کھائے- یہاں کی چہل پہل، عمارتوں کی شان اور لوگوں کا تنوع دیکھ کر احساس ہوا کہ لندن واقعی دنیا کا ایسا چوراہا ہے۔ جہاں ہر رنگ، ہر زبان اور ہر ثقافت کی گونج سنائی دیتی ہے۔

لندن میں مادام تساؤ میوزیم کے بارے میں رشید خان نے سن رکھا تھا۔ اگلی صبح دونوں ٹرام سے مادام تساؤ میوزیم لندن جا پہنچے۔ جب ٹکٹ کا پتا کیا تو کافی مہنگے تھے۔ مہنگے ٹکٹ خریدنے کی رشید خان کو ہمت نہیں ہوئی۔ دونوں سڑکوں پر پیدل گھومتے رہے اور رات کو ہوٹل جا کر سو گئے۔

اگلی صبح دونوں ٹرین سے واپس برمنگھم چلے گئے۔

راستے میں صفیہ کا جی متلانے لگا۔ جسے اس نے سفر کا شاخسانہ سمجھا۔ مگر بات کچھ اور تھی۔ شادی کے چار سال بعد صفیہ امید سے ہو گئی۔

oooooooooo

محمد بی بی کو اکبر خان کا تار ملا۔ اسلم خان کی طبعیت خراب تھی- محمد بی بی فٹافٹ پہنچی۔ اسلم خان کی آخری سانسیں چل رہی تھی۔ وہ باپ سے لپٹ کر رونے لگی-قدسیہ بیگم کے بھی آنسو گر رہے تھے۔ بہوئیں ارد گرد کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی-اتنے میں اسلم خان کی روح پرواز کر گئی-رونا دھونا مچ گیا-جنازہ عصر کے وقت اٹھا۔ اہل محلہ نے بھرپور شرکت کی۔ اسلم خان کے اچھے اخلاق کی بدولت جس نے سنا۔ افسوس کیا۔ قدسیہ بیگم عدت میں بیٹھ گئی- محمد بی بی ماں کی خدمت میں لگ گئی۔ قدسیہ بیگم کو تو چپ سی لگ گئی-عمر بھر جس شوہر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اسکا جانا عجیب سا سانحہ لگ رہا تھا۔

محمد بی بی چہلم کروا کر ڈبا والا واپس آ گئی -گھر کی زمہ داریاں عورت کی جان نہیں چھوڑتی - غمی ہو یا خوشی۔

بیوگی نے قدسیہ بیگم کو کمزور کر دیا تھا۔ اب وہ رعب و دبدبہ قائم نہیں رہا تھا۔ شوہر کے گزر جانے کے بعد اس کی کمی قدسیہ بیگم کو بہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ چند ماہ گزر گئے -ماں کو عدت سے اٹھانے محمد بی بی فیصل آباد آئی - بھابھیوں کا برتاؤ دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ ماں کا دل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی - جتنے دن محمد بی بی رہی - قدسیہ بیگم نے اسے پاس سے ہٹنے نہیں دیا - جب محمد بی بی کے جانے کا وقت آیا تو قدسیہ بیگم محمد بی بی کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی - محمد بی بی پر کنبے کی زمہ داری تھی وہ بچاری کیا کرتی - روتی ہوئی ڈبہ والا واپس آ گئی - قدسیہ بیگم بیٹوں کی محتاج ہو گئی تو بہوؤں نے بھی پر پرزے نکال لیے۔ قدسیہ بیگم کا پاندان ایک بہو نے چوری کر لیا- دوسری اسٹور سے قیمتی اشیا اور برتن غائب کرنے لگی۔ ذیابیطس نے قدسیہ بیگم کے حسن کو چاٹ لیا- وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ لوچ دار بدن کی گولائیاں بیماری میں گھل گئی - وہ پرہیزی کھانا کھانے لگی۔ نقاہت زدہ قدسیہ بیگم کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا۔ وہ اپنے کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔

بہوؤں کا دل چاہتا تو کمرے میں جھانک لیتی ۔ نہ دل چاہتا تو ملازمہ سے ساس کا حال پوچھ لیتی ۔ قدسیہ بیگم کی سلطنت ان کے سامنے لُٹ رہی تھی اور وہ بہت مجبور تھی۔ عبادت کی قدسیہ بیگم کو عادت نہیں تھی۔ انکا وقت کاٹے نہ کٹتا۔ یاسیت زدہ ہو کر رونے لگتی اور شوہر کو یاد کرنے لگتی۔ دو سال گزر گئے - قدسیہ بیگم کے دن پورے ہو گئے -ماں کی بیماری کی خبر سن کر محمد بی بی قدسیہ بیگم کے پاس فیصل آباد رہنے آ گئی۔ حویلی کا حال دیکھ کر پریشان ہوئی لیکن کیا کر سکتی تھی۔ ماں کی خدمت کرنے لگی۔ قدسیہ بیگم نے اپنا زیور جو چھپا کر رکھا تھا- چپکے سے محمد بی بی کو دے دیا۔

چند دن بعد قدسیہ بیگم انتقال کر گئی۔ موت کی رسومات کی ادائیگی کے بعد محمد بی بی ڈبہ والا گاؤں واپس چلی گئی قدسیہ بیگم کی وفات کے بعد عالیشان حویلی کی رونقیں بھی ماند پڑنے لگی تھی۔

ملازمین کی فوج کو نکال دیا گیا تھا۔

ایک عورت تھی جو اوپر کے کام کے لیے رکھی گئی تھی۔

ہزاروں صبحیں اور شامیں اس حویلی کے آنگن میں طلوع و غروب ہو چکی تھیں۔ قدسیہ بیگم نے اپنا رہن سہن اشرافیہ جیسا رکھا ہوا تھا۔ بہوؤں کو نہ تو حویلی کی قدر تھی اور نہ ہی تہذیب سے دلچسپی تھی۔

زندگی کی رفتار کے سبب ماضی کی پُر شکوہ لمحات کی عکاس حویلی سے برکت اور سکون اٹھ چکا تھا۔
قدسیہ بیگم کی محبت نے حویلی کو جگمگار کھا تھا انہیں روایات سے لگاؤ تھا۔
قدسیہ بیگم کی وفات کے بعد اس شاندار حویلی کا زوال شروع ہو گیا۔ گھر کی شان اس کے مکینوں سے باقی رہتی ہے۔ مکین گزر جائیں یا پھر ہجرت کر جائیں تو وقت ان گھروں کے دیوار و در پر گرد کی دبیز تہہ جما دیتا ہے - جن میں ہر وقت گہما گہمی کا سماں رہتا ہو۔
زبوں حالی کے باوجود یہاں اب بھی ہر طرف ایک شان
سی بکھری پڑی تھی۔ گم ُگزشتہ ماضی سے جڑی اپنے حال پر نوحہ کناں حویلی خاموش کھڑی تھی۔
اکبر خان نے حویلی پر قبضہ کر کے چھوٹے بھائیوں کو بیوی بچوں سمیت حویلی سے نکال دیا تھا۔ وہ بچارے کرائے کے مکانوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ اکبر خان اکیلا ساری جائیداد پر قابض ہو گیا اس کی بیوی بہت چالاک عورت تھی۔ اس نے اکبر خان کو بہن بھائیوں سے کاٹ دیا۔
اکبر خان کے بیٹے آوارہ اور نالائق نکلے - انہوں نے اکبر خان کا جما جمایا کاروبار بیچ کھایا - اکبر خان اس غم میں بستر سے لگ گیا۔ اور ایک دن دل کا دورہ پڑنے سے گزر گیا - ماں کتنی وفات کے تین سال بعد محمد بی بی نے دوبارہ حویلی میں قدم رکھا - بھائی کے قل ہوا کر وہ واپس لوٹ گئی - جب اکبر خان کے بیٹوں کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ رہا تو وہ باغ کا رقبہ بیچ کر کھانے لگے - آہستہ آہستہ سارا باغ بک گیا - رنگ و روغن سے محروم حویلی رہ گئی۔

ooooooooo

جمیل کا بیٹا قاسم تین سال کا ہو چکا تھا۔ محمودہ پھر امید سے تھی۔ قاسم دادا، دادی کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ بہت پیارا بچہ تھا
محمودہ نے پھر بیٹے کو جنم دیا جس کا نام عارف خان رکھا گیا۔
ڈبہ والا گاؤں میں گاؤں سے باہر قبرستان کے ساتھ لڑکوں کا پرائمری اسکول تھا۔ حسنہ کے دونوں بچے اسی اسکول سے پڑھے تھے۔ بڑے کبیر نے پانچ جماعتیں پاس کی اور ٹوبہ کے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ چھوٹی فاطمہ چوتھی جماعت میں تھی۔
حسنہ کے دونوں بچے ذہین تھے۔ چست اور شرارتی تھے۔

صفیہ سے چھوٹی پروین کی شادی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قریبی قصبے گوجرہ کے گاؤں کلیان داس میں کردی گئی-اس کا شوہر دہقان تھا۔ اس کے سسر کی کافی زمین تھی ۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن تھی ۔ سب اپنے اپنے راستوں پر زندگی کا ہاتھ پکڑ کر گامزن تھے اور اس طرح دس سال گزر گئے۔

oooooooooo

پاکستان کو معرض وجود میں آئے اٹھارہ ہو چکے تھے ۔ ۱۹۶۵ کا سال لگ چکا تھا۔ ابتدائی دور کی مشکلات پر قابو پالیا گیا تھا- ترقی کا سفر جاری وساری تھا۔ عظیم خان بوڑھا ہو چکا تھا۔ رفیق خان کے بڑا بیٹے کبیر خان کو ائیر فورس میں کمیشن مل گیا۔ جب کہ چھوٹی بیٹی فاطمہ انٹر جماعت کی طالبہ تھی۔

آج رفیق خان بر کی کے لیے بہت بڑا دن تھا-اس کے بیٹے کی پاسنگ آوٹ پریڈ تھی ۔ رفیق خان اور جمیل خان ائیر فورس کی رسالپور اکادمی میں موجود تھے۔ تقریب بہت شاندار تھی ۔ جنرل ایوب خان چیف گیسٹ تھے۔ تقریب کا آغاز تلاوت اور اختتام شاندار پریڈ سے ہوا۔ رفیق بہت خوش تھا اس کا بیٹا کمشنڈ آفیسر بن گیا تھا۔ کبیر خان نے ایئرونا ٹیکل انجنیر کی حیثیت سے ہوائی فوج میں شمولیت اختیار کی تھی ۔ اس کا رینک فلائنگ آفیسر کا تھا۔

جمیل خان کا بیٹا قاسم بارہ برس کا ہو چکا تھا-وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہائی اسکول میں جماعت ششم کا طالب علم تھا۔ اس سے چھوٹا عارف چوتھی کا طالب علم تھا۔

ooooooooooo

گیارھواں باب

صفیہ کی خودکشی

برمنگھم میں صفیہ کی بیٹی زاہدہ دس سال کی ہو چکی تھی۔ وہی صفیہ کے جینے کی واحد وجہ تھی۔ رشید خان کے تو وہی پرانے تیور تھے۔ بے لحاظ، بدمزاج آدمی تھا وہ۔

صفیہ پاکستان جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔

وہ سات سال بعد پاکستان جارہی تھی -وہ بہت خوش تھی۔ زاہدہ کے بعد صفیہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

کرسمس کی چھٹیوں کے ساتھ انہوں نے مزید چھٹیاں شامل کی۔ صفیہ اس کا شوہر اور بیٹی ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے اور کراچی سے لاہور چلے آئے -صفیہ کے سسرال میں سب بہت خوش تھے۔ گویا عید کا سماں تھا۔ لیکن یہ منظر دیرپا نہیں تھا۔ چند دن تو ملنے ملانے میں نکل گئے۔

صفیہ کی ساس بوڑھی ہو چکی تھی -دیور نندیں بیاہے جا چکے تھے -اس کے باوجود ساس کے لالچ کا وہی حال تھا -وہ پیسہ پیسہ جوڑتی تھی۔ رشید کے بھیجے ہوئے پونڈ جمع کرتی رہتی۔

گھر کا خرچہ بہت تنگی سے دیتی۔ سب اس بڑھیا کو ناپسند کرتے تھے -لیکن اس کے سامنے چپ رہتے۔ وجہ اس عورت کی گز بھر لمبی زبان تھی -اسے بہوؤں سے بات کرنے کی تمیز نہیں تھی۔ وہ بہوؤں کے والدین کو گالیاں دیتی۔

بہوؤں پر جھوٹے الزامات لگاتی -ان کی غیبت اور چغلیاں ہر مہمان، ہمسائی اور رشتے دار سے کرتی۔ اس عورت کی بدزبانی سے سب عاجز تھے۔

لیکن مجبور تھے -صفیہ سے بھی ساس نفرت کرتی تھی۔

ہفتے بعد صفیہ نے مائیکے کا رخ کیا۔

رشید خان، صفیہ اور زاہدہ تینوں ڈباوالا اسٹیشن پر پہنچے تو بھرپور استقبال کیا گیا۔

ڈبہ والا میں گویا جشن کا سماں تھا۔ عظیم، رفیق، جمیل اور سب بہت خوش تھے۔ تحائف دیے گئے۔

اعلی مہمان نوازی ہوئی۔

تین دن بعد رشید خان واپس لاہور لوٹ گیا۔

صفیہ رشید کے دل سے کب کی اتر چکی تھی۔

ماں کے سینے سے لگ کر صفیہ کے بے قرار دل کو سکون ملا۔

صفیہ نے ماں سے بہت باتیں کی۔ اسی دوران صفیہ کی نانی، نانا گزر گئے تھے۔

انکی باتیں دونوں ماں بیٹی کرنے لگی۔

حسنہ کے والدین بھی وفات پا گئے تھے۔

مرحومین کا ذکر کر کے انکے لیے صفیہ اور اس کی ماں اور حسنہ اور محمودہ افسردہ ہو گئے۔ محمد بی بی بٹوارے کے زخم تازہ کرنے لگی۔ اسکی بہو حسنہ کا سارا ننھیال بٹوارے میں قتل ہو گیا تھا۔ حسنہ بلک بلک کر رونے لگی۔ محمودہ افسردہ ہو گئی- صفیہ خاموشی سے ماں کی باتیں سنتی رہی۔ پھر بھابھی کو چپ کروانے لگی۔ اس نے رشید خان کے دیے درد سینے میں دبائے رکھے۔ اس کا بہت دل چاہا- ماں سے کہہ دے لیکن ماں کو مزید غمزدہ کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ابھی ایک ہفتہ کی گزرا تھا کہ فیصل آباد سے اکبر خان کی بیوہ محمد بی بی کی بھاوج کی وفات کی اطلاع آ گئی- محمد بی بی، عظیم خان، رفیق، جمیل، صفیہ اور زاہدہ چوتھی پر پہنچے۔

حویلی کی خستہ حالی دیکھ کر وہ حیران رہ گئے - حویلی کا کشادہ صحن سکڑ چکا تھا- صحن کا رقبہ بیچ دیا گیا تھا۔ اب حویلی صرف عمارت پر مشتمل تھی۔ بر آمدے میں جنازہ رکھا تھا- اکبر خان کی بیوی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ کمزور اور مدقوق۔ جو سلوک اپنی ساس کے ساتھ کیا تھا وہی لاوارثی کا سلوک اس کی بہوؤں نے اس کے ساتھ کیا- علاج معالجے کی کمی نے اسے وقت سے پہلے موت کی نیند سلا دیا۔

واپسی پر صفیہ ماں سے کہنے لگی "بے بے جب ہم نے پہلی بار اس حویلی میں قدم رکھا تھا- یاد ہے۔ کیسی شان و شوکت تھی۔"

"بس دھیے وقت سب کھا گیا"-- محمد بی بی یہ کہہ کر رونے لگی-

پنوں کی محبت سے سرشار اور سیراب صفیہ بہت خوش تھی۔

دو ہفتے بعد صفیہ اپنے بھتیجے اور بیٹی کے ساتھ لاہور واپس پہنچی تو گھر پر کوئی نہیں تھا۔ بار بار دروازہ بجایا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ ہمسایوں کی چھت سے جا کر صفیہ کا بھتیجا بیرونی دروازہ کھول آیا اور وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ بھتیجے اور بیٹی کو صفیہ نے بیٹھک میں بٹھایا اور خود رہائشی کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔ اندر سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ صفیہ نے دروازہ کو دھکا دیا تو حیرت سے اسکی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئی-رشید ایک رشتہ دار عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ دونوں کو نازیبا حالت میں دیکھ کر صفیہ شور مچانے لگی۔

بند کر اپنی بکواس۔ پاگل"

"عورت۔ نہیں تو کھڑے کھڑے طلاق دے دونگا۔

رشید خان نے دھمکایا

صفیہ روتی ہوئی بیٹھک میں واپس آئی۔ بھتیجے کو جانے کا کہا-اس نے وجہ پوچھی تو طبعیت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ وہ چلا گیا۔ رشید کی ناجائز تعلقات والی عورت بھی چلی گئی-رشید خان نے صفیہ کو ڈرایا دھمکایا اور کسی سے ذکر نہ کرنے کا کہا۔ صفیہ بالکل ٹوٹ گئی تھی۔

اتنا بڑا دھوکہ میرے ساتھ -وہ دل میں سوچتی-اسے تو چپ ہی لگ گئی-کاش میں نے اس آدمی کے پیچھے زندگی نہ ضائع کی ہوتی-اسے حیدر یاد آنے لگا-اس سے دوستی کر لیتی تو اچھا تھا-یہ بے وفائی کرتا رہا اور میں وفا نبھاتی رہی وہ اندر ہی اندر لاوے کی طرح پک رہی تھی-

چند دن گزرے۔ سب گھر والے قریبی رشتہ داروں کی شادی پر گئے ہوئے تھے۔ زاہدہ بھی ساتھ گئی تھی-صفیہ اکیلی گھر پر تھی۔ وہ بیٹھ کر رونے لگی۔ رشید کی زیادتیاں اسے یاد آنے لگی-روتے روتے اس کی دماغی حالت اس قدر بگڑی کہ اس نے اسٹور سے رسی لی اور پھندا لگالیا۔ جب سب شام کو واپس پہنچے تو صفیہ کی پنکھے سے لٹکی لاش ملی

رونا دھونا مچ گیا۔

ڈبہ والا صفیہ کی موت کی خبر پہنچی تو عظیم ، محمد بی بی ، رفیق ، حسنہ ، جمیل ، پروین ، رفیق اور جمیل کی بیوی محمودہ اور عظیم کے سمدھی سب لاہور جا پہنچے ۔ وہاں پہنچ کر ان کو خودکشی کا علم ہوا۔ محمد بی بی دنگ رہ گئی ۔ وجہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

"کتنے سال بعد میری بیٹی آئی تھی - میں اپنی ہی دکھ کہتی رہی - کاش اسکی سن لیتی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور وہ ایسا قدم نہ اٹھاتی۔"

اس نے نواسی کو سینے سے لگایا اور کھانا کھلا کر سلا دیا۔

محمد بی بی کو صفیہ کا غم اندر ہی اندر کھانے لگا۔ ننھی زاہدہ حیران سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ اسکے کچے ذہن پر جو منفی اثرات پڑ رہے تھے - اس کی کسی کو ہوش نہیں تھی۔ وہ سب کچھ اسفنج کی مانند اندر جذب کر رہی تھی - اس نے ماں باپ کے رویے میں آئی سرد مہری اور تلخیص بھی محسوس کی تھی - ماں کی موت نے اس کے دل میں باپ کی نفرت پیدا کر دی تھی -

تنہائی میں محمد بی بی نے بہلا پھسلا کر زاہدہ سے رشید کے بارے میں پوچھا - جس کے جواب میں زاہدہ نے باپ کے ناروا سلوک کا ذکر کیا۔ محمد بی بی کیا کر سکتی تھی - بچاری خاموش ہو گئی۔

خودکشی کی اصل وجہ صرف رشید خان کو معلوم تھی مگر وہ چپ تھا۔

تھانے والے لاش لے گئے - پوسٹ مارٹم ہوا پھر تدفین کر دی گئی۔ چہلم کے بعد رشید خان بیٹی کو لے کر ولایت واپس چلا گیا۔

وہاں جا کر کچھ عرصے بعد رشید خان نے دوسری شادی کر لی۔ اس کی نئی بیوی انگریز تھی - جس کے ساتھ رشید کے شب وروز رنگین گزرنے لگے - اس نئی بیوی کی بے باکی اسے بہت پسند تھی - شرم وحیاء کی پتلی صفیہ رشید کے لیول کی نہیں تھی - وہ نئی بیوی کے ناز اٹھاتا تو زاہدہ حیرت سے دیکھتی - اس انگریز سوتیلی ماں کو زاہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ زاہدہ کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے برابر تھا۔ زاہدہ محرومیوں میں پلنے لگی۔ ماں کی دردناک موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ رشید خان کا جملہ "حرام موت مری سالی

اسے بہت اذیت دیتا۔ وہ خاموش طبع ہو گئی۔

رشید خان کو میم سے ایک بیٹا ہو گیا۔ اب تو اس کا تکبر اور بڑھ گیا۔ وہ مزید بد دماغ ہو گیا۔

زاہدہ بچاری کا درجہ گھر میں کام والی کا ہو گیا۔ وہ خاموشی سے قسمت کا لکھا کاٹنے لگی۔
وہ گھر کے کام کے ساتھ چھوٹے بھائی کو بھی سنبھالتی - آزاد مغربی ماحول میں کئی لڑکوں نے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھائے لیکن زاہدہ اپنے خول میں سمٹی رہی۔

ooooooo

باھواں باب

جنگ ۱۹۶۵

اپریل ۱۹۶۵ میں دونوں ممالک کے درمیان رن آف کچھ کے ویران علاقے میں سرحدی تنازع پر جھڑپیں پاک بھارت جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔

یہ علاقہ صحرائی تھا- یہاں چرواہے کبھی کبھار اپنی بھیڑ بکریاں چرانے جایا کرتے تھے یا بھولے بھٹکے کبھی پولیس والوں کا دستہ گشت کر لیا کرتا تھا۔

جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے یہاں پاکستان بہت فائدے میں تھا کیونکہ اس علاقے سے محض ۲۶ میل کے فاصلے ہی پر ان کا ریلوے سٹیشن بدین تھا- جہاں سے بذریعہ ریل کراچی کا فاصلہ صرف ایک ۱۱۳ میل تھا۔ پاکستان کی آٹھویں ڈویژن کا یہیں پر ہیڈ کوارٹر تھا۔

دوسری طرف انڈیا کی جانب سے کچھ کے میدان میں پہنچنے کے تمام راستے تقریباً ناقابلِ رسائی تھے۔ سب سے نزدیک ۳۱ویں بریگیڈ احمد آباد میں تھی جہاں سے نزدیکی ریلوے سٹیشن بھوج سے ۱۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بھوج یوں تو اس علاقے کا ایک چھوٹا شہر تھا لیکن متنازع پاکستانی سرحد سے ۱۱۰ میل کے فاصلے پر تھا۔

جھگڑے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انڈین سکیورٹی فورسز کو پتہ چلا کہ پاکستان نے ڈینگ اور سرائی کو ملانے کے لیے ۱۸ میل طویل ایک کچی سڑک بنالی ہے۔ یہ سڑک کئی مقامات پر بھارتی سرحد کے ڈیڑھ میل اندر تک جاتی تھی۔ انڈیا نے اس مسئلے پر احتجاج کیا۔

جو جنگ میں بدل گیا۔

یہ جنگ ۱۷ دن جاری رہی (٦ ستمبر سے ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ تک) اور یہ آہستہ آہستہ ایک روایتی جنگ میں تبدیل ہو گئی -جس میں وسیع پیمانے پر ٹینکوں کی لڑائیاں، فضائی جنگ اور توپخانے کی گولہ باری شامل تھی۔

پاکستان کی فضائیہ کی کارروائی اِس جنگ میں بھی شاندار تھی جس کی ساری دنیا نے تعریف کی تھی۔ پاک فضائیہ نے پہلے ہی ہلّے میں انڈیا کی فضائیہ کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔

انیس و پینسٹھ کی پاک بھارت جنگ مختلف محاذوں پر لڑی گئی - جن میں پنجاب، کشمیر، راجستھان اور سندھ شامل تھے۔

پنجاب فرنٹ سب سے زیادہ متحرک رہا۔ جہاں لاہور، سیالکوٹ اور قصور، کھیم کرن کے علاقوں میں بڑی لڑائیاں ہوئیں۔

لاہور کے نواح میں برکی اور ڈوگرائی پر بھارتی حملے ہوئے۔

چونڈہ میں لڑی جانے والی ٹینکوں کی جنگ دنیا کی ٹینکوں کی بڑی جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔

کشمیر کا محاذ جنگ کا مرکزی نکتہ تھا کیونکہ مسئلہ کشمیر ہی تنازع کی اصل جڑ تھا۔

یہاں چمب - جوریاں، اکھنور اور حاجی پیر پاس میں شدید لڑائی ہوئی۔

حاجی پیر پاس کی فتح کو انڈیا کی سٹریٹجک کامیابی سمجھا گیا کیونکہ یہ دراندازی کے راستوں پر کنٹرول دیتا تھا۔

کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں لڑنا فوج کے لیے سخت آزمائش تھا۔

راجستھان کے ریگستانی سیکٹر میں بھی دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔

اہم مقامات میں مُناباؤ، بارمیر، گدھر اروڈ اور جیسلمیر شامل تھے۔

یہاں زیادہ تر لڑائی محدود نوعیت کی تھی لیکن بھارتی دفاع کو پیر پگاڑا کے حُروں نے چیلنج کیا۔

کی جغرافیائی سختی نے کارروائیوں کو محدود رکھا۔

جنوبی سندھ میں بھی جھڑپیں ہوئیں، خاص طور پر رن آف کچھ کے مقام پر۔

یہ جھڑپیں اپریل ۱۹۶۵ میں ہوئیں - جو جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

بعد ازاں کُھوکھراپار، عمر کوٹ جیسے سرحدی علاقوں میں محدود لڑائیاں ہوئیں۔

یہ محاذ کم شدت کا تھا لیکن جنگ کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو

علاقائی فتوحات ہوئی ان میں

انڈیا نے تقریباً ۱,۸۴۰ مربع میل پاکستانی علاقہ قبضے میں لیا - خاص طور پر لاہور، سیالکوٹ اور سندھ کے محاذوں پر۔ انڈیا کی اہم فتوحات میں شامل ہیں:

حاجی پیر پاس (پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں)، جو ایک سٹریٹجک لحاظ سے اہم پہاڑی راستہ تھا اور گوریلا جنگجوؤں کی دراندازی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

لاہور کے نواحی علاقے جیسے برکی اور ڈوگرائی کے کچھ حصوں پر انڈیا نے قبضہ کیا۔

سندھ کے کچھ علاقے، جیسے گڈرا روڈ (رن آف کچھ کے قریب) انڈین فوج قابض ہوئی۔

پاکستان نے تقریباً ۲۱۰ سے ۲۵۰ مربع میل انڈین علاقہ قبضے میں لیا، زیادہ تر چھمب-جوریاں سیکٹر (جموں) میں، جن میں یہ سیکٹرز شامل ہیں:

کھیم کرن کے ارد گرد کے دیہات -اگرچہ پاکستان آخر کار قبضہ برقرار نہ رکھ سکا۔

اکھنور کی طرف پیش قدمی کی گئی لیکن انڈین مزاحمت کی وجہ سے پاکستان مقاصد حاصل نہ کر سکا۔ دونوں جنگی فریقین کو جانی اور سامان حرب کے نقصانات ہوئے-

پاکستان کی دفاعی قوت بھارت کے مقابلے میں کم تھی-اس کے باوجود پاکستانی فوجی شجاعت سے لڑے۔ بھارت کو نقصان پہنچایا۔ فلائنگ آفیسر کبیر خان کی ڈیوٹی بڈھ بیر ائیر بیس پر لگی ہوئی تھی۔ تیسرے دن جنگ بندی ہو گئی- اس کے بعد معاہدہ تاشقند ہو گیا۔

اور حالات پر امن ہو گئے

سنہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں دونوں جانب سے کامیابی کے دعوے کیے جاتے ہیں لیکن دنیا کے اکثر تجزیہ نگار اسے تعطل پر ختم ہونے والی جنگ کہتے ہیں جو دونوں فریقین کے تھک جانے کے بعد ختم ہو گئ

جنگ بندی ہوئی تو کبیر خان کے والدین اور دادا دادی کی جان میں جان آئی۔۔

oooooooo

رشید خان کا بیٹا گوہر خان بچپن سے ہشیار اور ذہین تھا۔ والدین کی آنکھوں کا تارا ہونے کے سبب اس میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی انگریز ماں نے اسے پر اعتمادی دی تھی۔

وہ کھیلوں، تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا اور انعام لے کر لوٹتا۔ رشید خان اسے دیکھ دیکھ کر جیتا۔ اسے اپنے بیٹے پر بہت فخر تھا-وہ بیٹے کے لاڈ اٹھاتا-بیٹے کی فرمائشیں پوری کرتا اور زاہدہ خاموشی سے دیکھتی رہتی۔

پاکستان سے رشید کی ماں کی بیماری کی اطلاع آئی تو وہ چاروں پاکستان پہنچے۔

رشید کی ماں حمیدہ کو کینسر ہو گیا تھا۔ وہ اسپتال میں داخل تھی -اس کی حالت بہت بری تھی مگر زبان فراٹے بھر رہی تھی۔ شاہدہ کو دیکھ کر اسکی ماں پر کیچڑ اچھالنے لگی -جب بولنے کہ ہمت نہیں رہی تو چپ ہوئی۔

جتنے دن رشید پاکستان میں رہا - زاہدہ رشتہ داروں کی زبانی اپنی ماں کی موت سے متعلق عجیب عجیب باتیں سنتی رہی۔

چند دن بعد حمیدہ مر گئی -جنازے پر زاہدہ کی ملاقات ننھیال سے ہوئی - محمد بی بی نے نوازی کو بہت پیار کیا اور بیٹی کو یاد کر کے روتی رہی -چہلم کے بعد وہ سب برطانیہ واپس چلے گئے۔

-چند برس گزرے زاہدہ کے حالات جوں کے توں ہی تھے۔

زاہدہ شادی کے قابل ہو چکی تھی ۔ رشید خان نے زاہدہ کا بوجھ سر سے اتارنے کا سوچا۔ زاہدہ کا رشتہ رشید نے پاکستان میں اپنی بہن کے گھر طے کر دیا۔

رشید خان کی بہن بھی اس کی ماں اور رشید جیسی ظالم تھی -

پاکستان جانے کی تیاریاں شروع ہو گئی۔

وہ سب پاکستان زاہدہ کی شادی کے لیے پہنچے۔ گوہر کی عمر اس وقت سات برس تھی - وہ پاکستان آکر بہت خوش ہوا۔

زاہدہ بیس سال کی سیدھی سادی کم گو لڑکی تھی۔

اس کا ہونے والا شوہر دوہاجو تھا۔ اپنی پہلی بیوی کو وہ طلاق دے چکا تھا۔ فضل احمد ایک کمزور مرد تھا- وہ جنسی طور پر نامرد تھا اور جذباتی حثیت میں ابنارمل تھا- شکی مزاج، احساس کمتری کا شکار ایک پاکستانی انسکیور مرد، کانوں کا کچا- وہ اپنی ماں اور بہن کے زیر اثر تھا- یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی پہلی شادی نہ چل سکی۔ رشید خان کو تو بیٹی کا بوجھ اتارنا تھا۔ بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکا دینا تھا۔ فضل احمد کی تنخواہ بھی کم تھی۔

سادگی سے شادی ہو گئی۔ زاہدہ کو کم عمری اور بھول پن میں فضل احمد کی کمزوری اور نامردی کی سمجھ نہ آسکی لیکن گزرے وقت کے ساتھ ساتھ اس کو بہت کچھ سمجھ آگیا۔

یہ اور بات ہے کہ وہ صبر کے سوا کچھ کرنے پر قادر نہیں تھی۔ اپنی ماں صفیہ کی طرح اس کے حصے میں بھی ازدواجی زندگی کا سکھ نہیں تھا۔

بات یہاں تک رہتی تو خیریت تھی مگر بات آگے بڑھ گئی - بہت آگے۔

وہ دن بھر سسرال کے ظلم سہتی۔ اپنی ماں کی حرام موت سے جڑے طعنے سنتی۔

اور شوہر کی بے اعتنائی

سہتی۔ باپ نے اس سے رابطہ ختم کر دیا تھا۔

ان حالات میں وہ تنہائی اور مایوسی کا شکار تھی۔ اسے تازہ ہوا کے لیے کوئی روزن درکار تھا۔

ساس نندوں نے گھر کے کام کا بوجھ اس کے سر پر لاد دیا تھا - وہ کچن سے نکلتی تو کپڑے دھونے لگتی، صفائی کرنے لگتی۔

زاہدہ کی نند کا بیٹا وسیم جو کہ کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ زاہدہ پر بری نظر رکھنے لگا - اب وسیم زاہدہ کے اردو گرد منڈلانے لگا - کام کے دوران زاہدہ کا بے ترتیب لباس اسے دعوت نظارہ دیتا اور وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب کیسے ہو سکتا تھا۔

ایک دن زاہدہ نہا کر بال سکھانے چھت پر چلی گئی - اتوار کا دن تھا وسیم کی کالج سے چھٹی تھی - وہ بھی دبے پاؤں زینہ چڑھ گیا - زاہدہ ہولے ہولے کچھ گنگنا رہی تھی - وسیم نے پیچھے سے زاہدہ کو دبوچ لیا - - اس نے زاہدہ کو بانہوں میں بھر لیا - اسے یوں لگا جیسے پھولوں کی نرم و نازک شاخ اسکے ہاتھوں میں ہو - ایسی ملائمت اس نے پہلی دفعہ محسوس کی تھی - وہ بے خود ہونے لگا - زاہدہ کو اچانک احساس ہوا تو خود کو چھڑا کر وسیم کو ڈانٹنے لگی - وسیم مسکراتا رہا اور پھر زاہدہ کو سامنے سے پکڑ لیا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیے - زاہدہ کے ہونٹوں کا رس پیتے پیتے وہ اور زاہدہ دونوں ہی سیر اب ہونے لگے کہ اچانک زاہدہ کی ساس کی آواز آئی

"زاہدہ او زاہدہ! کہاں مر گئی! نیچے آ کر برتن دھو -"

وسیم نے زاہدہ کو چھوڑا اور اس کی آنکھوں ں میں دیکھ کر بولا!

تم بہت خوبصورت ہو، بہت پیاری، بہت دلکش۔

زاہدہ اور وسیم کا یہ اولین سنسنی خیز تجربہ تھا - دونوں ہی سرشار ہو چکے تھے۔

جس حبس اور گھٹن کے اندھیرے میں زاہدہ قید تھی - اس میں وسیم کی وارفتگی روشن دان سے آنے والی اس روشنی کی لکیر کی مانند تھی - جس میں تیرتے ہوئے چھوٹے ذرات وحدت میں بالکل ویسی ہی کثرت رکھتے تھے۔

جیسی سر خوشی وسیم کی ہوس رکھتی تھی - زاہدہ خوش رہنے لگی، مسکرانے لگی - اس کے بے حس شوہر کو کچھ خبر نہیں تھی۔

وسیم زاہدہ کا خیال رکھنے لگا - اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگا۔

اور اس نے زاہدہ سے دوستی کر لی - وہ عمر میں زاہدہ سے چند برس چھوٹا تھا۔ زاہدہ کی عمر پچیس سال اور اس لڑکے کی بائیس سال تھی۔ وہ آتے جاتے زاہدہ کو گدگدانے لگا۔ موقع محل دیکھ کر مزید پیش قدمی بھی کر لیتا - زاہدہ کو اس کی یہ چھیڑ چھاڑ اچھی لگنے لگی۔ وہ برف کی سل کے ساتھ رہتے رہتے اکتا گئی تھی۔ زاہدہ کے پر شباب بدن میں وسیم کے لیے خاص کشش تھی تو زاہدہ کو بھی جسمانی ضرورت کی تکمیل درکار تھی -

وسیم کو ایک دن موقع مل گیا - سب گھر والے شادی پر گئے تھے - زاہدہ کو بخار تھا - وسیم گھر آیا تو گھر خالی دیکھ کر اس کے اندر کا شیطان جاگ گیا - وہ زاہدہ کے کمرے میں گیا - زاہدہ دوائی کھا کر غنودگی میں تھی - وسیم نے زاہدہ کا زیر جامہ اتارا - زاہدہ کسمسائی - وسیم کے ہاتھ زاہدہ کی قمیض میں رینگ گئے - نرم نرم چھاتیاں اس کے ہاتھوں میں پھڑکنے لگی - اس نے آہستہ سے زاہدہ کو اوپر کی طرف دھکیلا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی - زاہدہ بیدار ہو گئی تھی -

"کون ہے؟"

زاہدہ نے پوچھا - وسیم نے جواب دینے کی بجائے اس کے ہونٹوں میں ہونٹ پیوست کر دیے - زاہدہ نے بدن کو ڈھیلا۔ چھوڑ دیا اور وسیم کا ساتھ دینے لگی -

چند منٹ بعد وسیم ہانپتا ہوا بیڈ پر گرا اور بے لباس زاہدہ کو دوبارہ بانہوں میں بھر لیا -

۔اس کے بعد یہ پریکٹس گاہے بگاہے ہونے لگی۔ بم اس وقت پھوٹا - جب زاہدہ کو حمل ٹھہر گیا۔

اب کوئی چارہ نہ پا کر زاہدہ نے وسیم سے کہا۔

وسیم نے بظاہر اس سے ہمدردی کی اور پلاننگ کر کے لاہور سے کراچی چلا آیا۔ اس نے ملازمت کا بہانہ کر کے گھر والوں سے رخصت لے لی۔

اب زاہدہ رہ گئی اور ابن آدم کا گناہ۔

جاتی تو کہاں جاتی - کرتی تو کیا کرتی۔

جب کوئی راستہ سجھائی نہ دیا تو زاہدہ نے بھی پھندہ لگا کر خودکشی کرلی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کے ماں بننے کا انکشاف ہوا- لیکن فضل احمد خاموش تھا- اپنے ماموں رشید خان کی طرح بالکل خاموش۔ عمر رسیدہ بڑھیا محمد بی بی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پہلے بیٹی اب نواسی نے خودکشی کرلی۔ کیوں ہوا ایسا۔ وہ خود سے سوال کرتی؟ آخر کہاں کمی رہ گئی تھی۔ دونوں نے حرام موت کو کیوں چنا۔ کیا دکھ تھا- جو اندر ہی اندر ان دونوں کو کھا گیا۔ کہ دونوں نے خود موت کی کتاب پر خود دستخط کر دیے۔ مجھ سے کہتی - میں سمجھتی ان کا کرب۔ محمد بی بی نہیں جانتی تھی -زاہدہ کے رحم میں موجود بچہ فضل کا نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا سوائے فضل کے۔ یکدم خودکشی اتنا بڑا اقدم۔

رشید خان نے تدفین کے لیے پاکستان آنے سے صاف انکار کر دیا۔ زاہدہ کو ماں کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ دو بد نصیب بدن، دو بے چین روحیں مر کر ساتھ رہنے لگی۔

oooooooooo

وقت گزرتا گیا۔ دن ماہ و سال میں ڈھلتے رہے۔ برطانیہ رشید خان کو بہت راس آیا۔ رشید خان کا بیٹا گوہر الیکشن لڑا اور جیت کر برمنگھم میں کونسلر بن گیا۔ رشید خان نے بھی فرنیچر کے دکان کو کارخانے میں بدل لیا۔ اب اس کا شمار شہر کے متمول افراد میں ہونے لگا۔ عزت دار اور محنتی افراد میں۔ گوہر خان محنت کرتا رہا۔ اس نے اگلا الیکشن جیتا اور ایم-ایل-اے

بن گیا۔

oooooooooooo

تیرہواں باب

پاکستان کا بٹوارہ

مارچ ۱۹۷۱

جنگیں اپنے ساتھ وحشت لاتی ہیں اور جاتے ہوئے ویرانی چھوڑ جاتی ہیں-

مارچ کا مہینہ پاکستان کے لیے تباہی اور بربادی لے کر آیا۔

موسم بہار کے دامن میں اب کی بار خزاں رسیدہ مرجھائے ہوئے پتے تھے-

الیکشن کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی ہار گئی۔ بھٹو صاحب نے الیکشن کے نتائج ماننے سے انکار کر دیا۔ شیخ مجیب الرحمن نے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک چلادی۔

اس احتجاج کو کچلنے کے لیے مغربی پاکستان سے فوجی دستے بھیجے گئے۔ فلائنگ آفیسر کبیر خان اس وقت کوہاٹ بیس پر تعینات تھا۔ اس کا نام مشرقی جانے والے فوجیوں کی لسٹ میں آ گیا۔

وہ سی-ون تھرٹی کے زریعے کراچی سے ڈھاکہ پہنچا-

یہاں اس کی ڈیوٹی آپریشن سرچ مارچ میں لگائی گئی تھی

پچیس مارچ کی رات تھی۔ ہر طرف جلاؤ گھیراؤ ہو رہا تھا۔

احتجاج کے لیے

لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ غیر بنگالیوں پر حملے کیے گئے۔ ان کے گھر اور دکانیں لوٹی گئی۔ شالا پنجابی کے نعرے لگائے گئے۔ یوم ماتم منایا گیا۔ بابائے قوم کی تصویریں جلائی گئیں۔ پاکستانی پرچم کی بے حرمتی کی گئی اور ڈھاکہ چھاؤنی کا گھیراؤ کیا گیا۔ امن وامان کی صورت حال بگڑتی چلی گئی۔

کبیر خان کی ڈیوٹی ڈھاکہ ائیر پورٹ پر لگائی تھی۔ وہ دن بھر جہاز کے ہینگر میں کام کرتے۔ جہازوں کی مینٹنس ان کی ذمہ داری تھی۔ پاکستانی آرمی والے دشمن کے سیدھے نشانے پر تھے- مکتی باہنی نے آرمی والوں پر حملے شروع کر دیے ایک لاکھ بنگالی ہندوستان ہجرت مر گئے ۔ اسی دوران شیخ مجیب الرحمن کو میجر بلال نے گرفتار کر لیا۔

حالات مزید خراب ہو گئے۔

غازی پور آرڈیننس فیکٹری میں پاکستانی فوجیوں کو مکتی باہنی کے کارکن مارنے لگے۔ ہندوستان نے ان کی لڑائی کی ٹریننگ کی۔

وہ گوریلا کاروائیاں کرنے لگے۔ برسات شروع ہو گئی -جنگل دلدل بن گئے۔ مسلسل بارش سے فضا میں نمی مزید بڑھ گئی-

کبیر کو بارش پسند نہیں تھی -جب چھوٹا تھا- توماں بارش میں کھیلنے نہیں دیتی تھی۔ اسے کمرے میں رہنے کا حکم ملتا تھا۔ بڑا ہوا توماں گھر سے باہر جانے نہیں دیتی تھی۔

یہاں بنگال کی بارش تو پنجاب سے کہیں زیادہ مقدار میں برستی تھی۔ موسم برسات بھی اس علاقے کا طویل ترین موسم تھا۔

پاکستانی فوجیوں کو دیگر کئی مسائل بھی درپیش تھے۔ وہ راستوں سے ناواقف تھے۔ انہیں ساحلی علاقوں میں رہنے کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ مقامی زبان سے نابلد تھے۔ غربت بہت تھی۔ عورتیں پیسے کے لیے ہر حد پار کرنے پر تیار تھی۔ غریب کا کوئی مذہب یا دھرم نہیں ہوتا اس کا مذہب صرف روٹی ہے -اس کے لیے وہ ہر حد کراس کر سکتا ہے۔ معمولی معاوضے پر ہر طرح کی خدمات میسر تھیں۔ گھریلو ملازمین کا حصول بہت آسان تھا۔ ایک کو نوکری کے لیے بلاؤ تو پورا گروہ آتا تھا۔

ننگ دھڑنگ بنگالی غربت کے ستائے ہوئے تھے۔

اس غربت کی تاریخ بہت پرانی تھی۔ انگریز دور میں پڑنے والے قحط نے ان کو نچوڑ دیا تھا لیکن یہ مقابلہ پنجاب سے کرتے تھے۔ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ خوش حال تھا۔ اردو زبان کو جب جناح صاحب نے قومی زبان قرار دیا تو بنگالیوں نے بہت احتجاج کیا-

انکے خیال میں ان کے حصے کی مراعات پر مغربی پاکستان قابض ہے -جب کہ پٹ سن اور مچھلی تو بنگالی پیدا کرتے ہیں۔

اب جب پاکستانی فوج کے دستے بنگال پہنچنے لگے -تو یہ لوگ نفرت سے ان فوجیوں کو دیکھتے۔

جنرل صاحب زادہ یعقوب علی خان مایوس ہو کر مغربی پاکستان واپس جا چکے تھے - فوج کی کمانڈ جنرل ٹکا خان کو سونپ دی گئی تھی۔ پاکستانی فوجیوں کا بہت نقصان ہو رہا تھا-

دوسری طرف بہاری بھی قتل کیے جا رہے تھے - اردو زبان بولنے والوں سے نفرت کی وجہ سے انہیں بڑی تعداد میں ذبح کیا گیا۔

مجیب الرحمن کے چھ نکات سیاسی اختلاف کی بڑی وجہ بنے۔

راشن کی کمی اسلحے کی کمی کے ساتھ ساتھ طبی سہولتوں کی بھی کمی تھی۔ ایک دن باغیوں نے بجلی کی تاریں کاٹ دیں ۔ ڈھاکہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ واپڈا کا عملہ پاکستان سے جہاز کے ذریعے بلایا گیا - وہ بجلی بحال کر رہے تھے کہ باغیوں کے حملے سے مارے گئے۔ ان کی لاشیں پاکستان بھجوائی گئی -

سپاہی اپنے افسر کے ماتحت ہوتا ہے - جو آرڈر جرنیل دیتا ہے - وہی حکم سب کو بجالانا پڑتا ہے - سپاہی کی اپنی سوچ اپنی ذاتی پسند ناپسند نہیں ہوتی۔

اس سب کے باوجود حملوں کا نشانہ فوج کے سپاہی اور افسر بنے۔ یہ سپاہی امن کے نفاذ کے لیے اتنی دور بلائے گئے تھے - ان کی لاشیں ہوائی جہازوں سے پاکستان بھیجی جانے لگی اور پھر جب لاشوں کی تعداد بہت بڑھ گئی - تو وہی پر تدفین کی جانے لگی - کئی کو تو قبر بھی نصیب نہ ہو سکی۔ جنگ بڑھتی گئی۔ پھیلتی گئی۔ جوانوں کو نگلتی گئی۔ بے قصوروں کو مارتی رہی - اعظم پور قبرستان ڈھاکہ عام بے گناہ لوگوں کی لاشوں سے بھر گیا -

آپریشن کے بعد دنیا کی ہمدردی بنگالیوں کے ساتھ ہو گئی۔ انڈیا کی کھلی کھلا مداخلت شروع ہو گئی -

نومبر میں بھارت نے حملہ کر دیا -

بھارت نے چار دسمبر کو بڑا حملہ بھارتی ائیر فورس کے ذریعے ڈھاکہ ائیر پورٹ پر کیا۔ انہوں نے بحری جہازوں پر بھارتی بحریہ سے حملہ کیا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کی سرحد پر بھی حملہ کر دیا۔ نو ماہ سے فوج خانہ جنگی میں مصروف تھی - اس کے باوجود پاکستان فوجی بے جگری سے لڑے - جس کا اعتراف جنرل سیم مانکشیا نے بھی کیا ۔ بھارت کا مقابلہ کرنے کی پاکستانی فوج میں سکت نہیں تھی۔ ایک دس کا مقابلہ وہ جیت بھی جاتے تو کیسے ؟

اپنے یعنی بنگالی دشمن بن گئے تھے غیروں سے مل گئے تھے۔ یہ مسلمانوں کی پرانی تاریخ ہے - غدار ہی ہمیشہ مرواتے ہیں۔

کبیر خان کے ہنگر کے پاس بھی بھارتی ہوائی جہازوں سے حملہ ہو گیا۔ کبیر خان بال بال بچا۔

وہ زیر زمین بنی سرنگ میں چھپ گیا۔ پاکستانی ہوائی جہازوں نے بھرپور جوابی کاروائی کی اور ہندوستان کے جہاز بھی تباہ کیے۔ ناکارہ ٹینکوں کے ذریعے دشمن کو ڈرانے کے لیے گشت کیا جاتا۔ اس کے بعد کار آمد ٹینک بھی لڑائی میں شامل ہو گئے -توپوں سے گولے داغے جاتے۔ ہندوستان نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے فوجی اتارنے شروع کر دیے۔ مکتی باہنی کے ارکان نے بھارتیوں کو پاکستانی فوجیوں کی نقل و حرکت بتائی۔ اور بنگالی فوجی بھی بغاوت کر کے ہندوستانیوں کے ساتھ مل گئے۔ بنگالیوں کے دلوں میں ایسی نفرت بھر گئی کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا لیڈر کہنے لگے

تمہارا جناح

تمہارا پاکستان

ہمارا بنگلہ دیش

یہ سوچ بنگالیوں کے ذہنوں میں رچ بس گئی۔ پاکستانی فوج دشمن فوج قرار پائی اور دشمنی کے سزا بھگتتی رہی۔ جناح کا پاکستان خواب و خیال ہونے لگا منافرت کی فضا رنگ دکھانے لگی-

مکتی باہنی نے راستے بند کر دیے -فوجیوں کو راشن کی سپلائی رک گئی۔

سولہ دسمبر ۱۹۷۱ء کے دن سقوط مشرقی پاکستان نے قوم پر سکتہ طاری کر دیا

کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پاکستان کے حصے میں ایسی رسوائی آئے گی - پاکستان کے چہرے پر اپنوں نے ہی کالک ملی - حکمران عیاش ہو۔ جرنیل مایوس ہو تو بڑی اور شرمناک فوجی شکست ہوا کرتی ہے۔

جنگ کا انجام بھی آغاز کی طرح عجیب تھا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو رمنا ریس کورس گراونڈ ڈھاکہ میں جنرل نیازی نے جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر دیے۔

سب سے پہلے جنرل نیازی نے جنرل اروڑا کو سیلوٹ کیا۔ پھر دستخط کیے پھر اپنا ریوالور پیش کیا

oooooooo

حسنہ نے شوہر کی جدائی سہی تھی۔ شادی کے فوراً بعد رفیق خان اور جمیل خان جنگ عظیم دوئم پر چلے گئے تھے۔ اب وہ بیٹے کی جدائی سہہ رہی تھی -بیٹا مشرقی پاکستان میں جنگ لڑ رہا تھا۔

رفیق خان جانتا تھا جنگ کیا ہوتی ہے۔ جنگ کی دہشت اور مارے جانے کا خوف اس نے دیکھا تھا۔ بہت قریب سے موت کو اس نے دیکھا تھا۔ وہ بے بس تھا اس کے اختیار میں ہوتا تو اپنے بیٹے کو جنگ کے حوالے نہ کرتا۔
لیکن وہ عوام میں سے تھا اور عوام کے پاس اختیار نہیں ہوتا - اختیار تو حکام کے پاس ہوتا ہے۔
پھر ایک خبر بجلی بن کر سارے وطن پر گری -
پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے -
یہ رمنا ریس کورس گراونڈ ہے۔ آج یہاں پاکستانی فوج کی ہتھیار ڈالنے کی تقریب منعقد کی گئی ہے۔ قطار میں کھڑے فوجیوں میں ایک چہرہ فلائنگ آفیسر کبیر خان بر کی کا بھی ہے - یہ سرخ و سفید چہرہ خفت سے سرخ ہے۔
شرمندگی، بے بسی اور خجالت نے اس کے تاثرات بگاڑ رکھے ہیں۔ کبیر نے بھی ریوالور پھینک فرش پر پھینک دیا۔
سب قیدیوں کو ڈھاکہ ائیر پورٹ پر جمع کیا گیا
سب افسردہ تھے۔ پریشان تھے - جرنیل بھی پشیمان تھے۔
اس جنگ کے نتیجے میں پاکستان کی آدھی سے زائد آبادی یعنی ساڑھے چھ کروڑ شہری پاکستانی شہریت سے خارج ہو گئے۔ بنگال کا رقبہ بھی ہاتھ سے گیا - ۹۳ ہزار فوجی جنگی قیدی بنے تھے آٹھ ہزار کے لگ بھگ مارے گئے اور ۲۵ ہزار سے زائد زخمی ہوئے تھے۔
سویلین کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔
دنیا میں پاکستان منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔
ڈبہ والا گاؤں میں رفیق کی بیٹی کبیر کی چھوٹی بہن فاطمہ کے لیے رشتہ آیا - فاطمہ میٹرک کر چکی تھی۔ رشتہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پٹھان گھرانے سے آیا تھا۔ لڑکا اسکول میں ٹیچر تھا۔
رفیق نے محمد بی بی اور حسنہ سے مشورہ کر کے ہاں میں جواب دے دیا۔ شادی کبیر کی وطن واپسی سے مشروط کر دی گئی۔ چند ماہ تو فاطمہ کے ہونے والے سسرالیوں نے صبر سے گزار لیے پھر شادی کا مطالبہ کرنے لگے۔
ان لوگوں کو بیٹی اور بیٹے کی شادی ایک ساتھ کرنی تھی۔ چار و ناچار رفیق کو بیٹی کی شادی کبیر کے بغیر کرنا پڑی۔ شادی والے گھر میں خوشی کا فقدان تھا۔ رسم دنیا نبھائی جا رہی تھی۔ رفیق اخوان نے اعلی پکوان پکوائے۔ بیٹی کو حیثیت سے زیادہ جہیز دیا۔

اور رخصت کر دیا۔ عظیم خان اور محمد بی بی بجھے بجھے سے تھے - ایک تو انکی عمریں زیادہ ہو چکی تھی۔ دونوں سو سال تک پہنچ چکے تھے - دوسرا پوتے کی قید کا غم کھا رہا تھا۔

oooooooooo

کبیر خان کو بھی دیگر ائیر فورس کے سپاہیوں اور افسروں کے ساتھ
سی - ون - تھرٹی میں سوار کروا کر مشرقی پاکستان بنگال بھیج دیا گیا -
حالات آہستہ آہستہ خراب ہونے لگے مکتی باہنی فوج سے متصادم ہونے لگی۔
چھبیس مارچ ۱۹۷۱ کو مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں جن میں رنگ پور، چاٹگام، سید پور اور دیو پور وغیرہ شامل تھے - مظاہرین اور فوج کے درمیان تصادم میں ۱۶۴ افراد مارے گئے۔
وہ عوام کو بچاتے رہے۔ لیکن حالات قابو سے باہر ہو گئے - ازلی کمینے دشمن بھارت کا وار چل گیا - اس نے اپنے فوجی بھیجے اور جنگ چھیڑ لی۔ ۲۳ نومبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔
تین دسمبر کو پاکستانی ائیر فورس نے ہندوستان پر حملہ کیا -
ناحق جو لہو بہتا ہے۔ وہ مسلمان کا ہوتا ہے۔ جس کا خون سب سے ارزاں ہوتا ہے - وہ مسلمان ہی ہے۔
پاکستان کی غلطیوں سے ہندوستان نے فائدہ اٹھایا۔
سنہرے پٹ سن کی زمین یعنی مشرقی پاکستان جس کے جیالوں نے تحریک آزادی کے لیے لیڈر اور کارکن دیے۔
چوبیس سال بعد اس سرزمین پر لیفٹینٹ جنرل امیر عبد اللہ خان نیازی نے بھارتی کمانڈر لیفٹینٹ جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ جنرل اروڑا جب ڈھاکہ پہنچا تو ائیر پورٹ پر جنرل نیازی نے استقبال کیا سیلوٹ مارا (یہ دن بھی آنا تھا ہائے ہائے)
رمنا ریس کورس پارک میں دونوں جرنیلوں نے جنگ بندی کے معاہدے ہر دستخط کیے۔ جنرل نیازی نے اپنا ریوالور جنرل اروڑا کے حوالے کر دیا۔
اسکے بعد تینوں افواج کے فوجیوں نے اس ڈر کہ انہیں بھی اس تذلیل سے گزرنا پڑے گا - اپنے ہتھیار آرڈیننس ڈپو میں جمع کروا دیے -
انیس دسمبر کو اجتماعی ہتھیار ڈالنے کی تقریب رمنا ریس کورس پارک میں منعقد کی گئی -

اور انہیں ہتھیار لانے کا حکم دیا گیا- جنرل جمشید کے حکم پر سب سے پہلے جنرل فرمان نے ریوالور پھینکا-سب نے باری باری ہتھیار ڈال دیے-اب وہ سب جنگی قیدی تھے-

ترانوے ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈالے۔

بیس دسمبر جو جنرل نیازی نے سپاہ سے الوداعی ملاقاتیں کی-نوے ہزار سے زیادہ فوجی اور سویلین جنگی قیدی ہوئے۔لوٹ مار شروع ہوگئی۔فوجیوں کے گھروں کا سامان مقامی غنڈے لوٹنے لگے-

اس کے بعد پاکستانی فوجی گیرابو ہوائی جہاز میں بیٹھ گئے۔نیچے نظر پڑی تو بنگلہ دیش چوری ہوچکا تھا۔سرما کی خوشگوار دھوپ بھری سہ پہر تھی لیکن فوجیوں کے جذبات پر اوس پڑی ہوئی تھی-بھارتی حفاظتی سپاہی طنزا مسکرا رہے تھے۔کبیر خان خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا-

جہاز نے ڈم ڈم ائیر پورٹ پر لینڈ کیا۔جہاز سے اتر کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ اترے-

ایک بلڈنگ میں ٹھہرایا گیا کھانے میں سبزی دال اور سفید چاول دیے گئے-وردیاں پہنائی گئی۔بستر دیا گیا۔اس کے بعد ٹرکوں میں سوار کروادیا گیا اور اصل مقام پر لے جایا گیا-یہ ایک کال کوٹھری تھی اندھیری ترین جگہ تھی -حشرات الارض سے بھری ہوئی تھی۔کوٹھری کا سائز ٦/٦ تھا-کبیر خان بے چارہ فرش پر بستر بچھا کر بیٹھ گیا۔مچھروں کی بھرمار تھی-

کھانے میں دال چاول نما بد ذائقہ ملغوبہ دیا جاتا جو پتھروں سے بھرپور ہوتی الومینم کے بد رنگ برتن میں کھانا ملتا تھا۔

ایک ماہ تک فوجیوں کو نہانے نہیں دیا گیا ڈیڑھ ماہ بعد شیو اور نہانے کی اجازت ملی-جس کے بعد ان سب کو تفتیش کے لیے ہندوستانی افسروں کے سامنے پیش کیا گیا۔

ہندوستانی افسروں کے سوالوں کا جواب ہر جنگی قیدی باری باری دیتا اور واپس کال کوٹھری میں بھیج دیا جاتا۔انہی حالات میں تاشقند معاہدہ ہوگیا۔اب سب قیدیوں کو ریل گاڑی کے ذریعے آگرہ لایا گیا۔راستے میں ہندوستان کی عوام کے غربت زدہ کمزور بدن دیکھنے کو ملے۔

oooooooo

چودھواں باب

جنگی قید

انہیں آگرہ کے رانچی ۹۵ جیل کے کیمپ میں رکھا گیا۔
یہاں حالات کچھ بہتر تھے۔ سختی کم تھی۔ کبیر خان اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں گزارنے لگا- اللہ سے لمبی لمبی دعائیں کرنے لگا- اسے اپنی ماں حسنہ بہت یاد آتی۔ حسنہ بھی اس کے لیے دعائیں کر رہی تھی- سب قیدیوں کی عافیت مانگ رہی تھی۔ رفیق خان تہجد گزار تھا- وہ بیٹے کی رہائی کے لیے دعا کر رہا تھا۔
ان ہی حالات میں رمضان آیا۔ کچھ قیدی اعتکاف بیٹھے -رو رو کر اللہ میاں سے دعا کی۔ لیکن دعائیں مستجاب ہوتی ہیں مشیت ایزدی سے - اور ان کے حصے میں ابھی اور قید لکھی ہوئی تھی۔ عید آگئی۔ قید و بند کی صعوبتوں میں خوشی کیسی۔
پھر بھی سب قیدیوں نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور عید ملی۔ انہیں ملنے والی ہر چیز پر جو ان کے استعمال میں تھی- اس پر لکھا ہوا تھا۔

POW۔

یعنی prisoner of war (جنگی قیدی)

کبیر خان کے ساتھیوں میں سے اکثریت نمازی ہوگئی۔ باجماعت نماز کا اہتمام ہوتا۔ قرآن پاک کا ترجمہ تفسیر پڑھا جاتا۔ وقت گزاری کے لیے دیگر مشاغل بھی اختیار کیے جاتے۔ تاش وغیرہ
کتابیں پڑھی جاتی۔ کھیل کھیلے جاتے۔ ورزش کی جاتی۔ اس سب کے باوجود وہ بہت ناخوش تھے۔ دال اور سبزی مسلسل کھا کھا کر ان کو گوشت کی کمی سے کمزوری ہوگئی تھی۔ کچھ قیدی ذہنی مریض بن چکے تھے۔ کچھ جنگ سے زخمی ہو کر آئے تھے انکے زخم بگڑ گئے تھے۔ علاج معالجے کی صورت حال بہت خراب تھی۔ کچھ کو کینسر ہو گیا کچھ کو ٹی بی۔ جو بیمار ہوتا اسے ہتھکڑی لگا کر کالا ہسپتال بھیج دیا جاتا یہ اسپتال انگریز نے ہندوستانی غلاموں کے لیے بنایا تھا۔ آج یہاں پاکستانی غلام بڑے تھے بے آسرا، محتاج
یہ حکمرانوں کے کرتوتوں کی سزا بھگت رہے تھے۔

ان میں سے بہت ساروں کے زخم ناسور بن چکے تھے۔ ان سے تنگ آ کر بھارت نے کچھ بیمار قیدی پاکستان بھیج دیے۔

باقی بھی جلد اپنے ملک جانا چاہتے تھے۔ کیوں نہ جانے کی آرزو کرتے - آگ اور خون کا دریا پار کر کے پاکستان لیا تھا۔ اس کا ایک بازو کٹ گیا تھا- جس کا غم تھا لیکن باقی وجود سے لپٹ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتے تھے۔

ہر عمر کے قیدی تھے۔ کچھ ریٹائرڈ فوجیوں کو جنگ کے لیے بھرتی کیا گیا تھا کچھ جوان تھے بچارے کنوارے۔ کچھ تھے شادی شدہ بال بچے دار۔

وہ ریڈیو سے خبریں سنتے۔ ریڈ کراس نامی تنظیم انہیں تحفے دیتی۔ پاکستان سے انکے پیاروں کے خطوط آتے۔ ان کے لیے تحائف بھی آتے لیکن صبر آزما دن کاٹے نہ کٹتے۔ قید طویل ہوتی جارہی تھی - دل بجھتے جارہے تھے۔ اعصاب تھک رہے تھے۔ مایوسی بڑھ رہی تھی۔

جنگی قیدیوں نے فرار کی کئی کوششیں کی۔ سرنگیں کھودی، کچھ قیدی بھاگ گئے مگر پھر پکڑے گئے۔ کچھ بھاگے تو جان سے گئے۔ کچھ آگرہ کی گرمی سہہ نہ پائے اور حبس سے مر گئے۔

دسمبر کا مہینہ آ گیا- سقوط ڈھاکہ کو سال ہو گیا۔ پہلی برسی تھی -پاکستانی جنگی قیدی دھاڑیں مار مار کے روئے -سب جنگی قیدی ماتم منانے لگے۔

پاکستان کی بدقسمتی کو، اپنی قسمت کو، پاکستان کی شکست کو، اپنی گرفتاری کو۔

بڑی عید آئی گوشت کہاں ملتا ہے بنیے کی قید میں۔

ان قیدیوں کو شدید سردی میں ناکافی گرم بستر میں گزارہ کرنا پڑتا۔ اب سرما کی بیماریاں لگ گئی۔ نزلہ زکام ریشہ وغیرہ

ہر نیا دن امید کی کرن کے ساتھ طلوع ہوتا اور مایوسی کے کرب کے ساتھ غروب ہو جاتا۔ رہائی کی افواہیں گردش کرتی مگر کچھ نہ ہوتا۔

ڈیڑھ سال گزر گیا۔

اب قیدی چڑچڑے ہونے لگے۔ مایوس ہونے لگے۔ خاموش ہونے لگے۔ مشاغل سے ان کا دل بھر گیا۔ ہندوستانی اخبارات رسائل جیل میں آتے۔ اکثر ان کی برین واشنگ کے لیے مقررین بھی بلائے جاتے۔ انہیں کبھی کبھار

فلم بھی دکھائی جاتی- جیل میں ناکافی سہولتیں تھیں- وہ بد دل ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ بد حواس ہو چکے تھے۔ جیل کا پریشر انہیں دماغی مریض بنا رہا تھا-

ادھر پاکستان میں انکے گھر والوں کا برا حال تھا۔ انہیں تنخواہ مقررہ وقت پر ملتی لیکن ان کے پیارے کس حال میں تھے؟

وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟

وہ نہیں جانتے تھے؟

کبیر خان بھی پژمردہ سا پڑا رہتا۔

پھر کسی ساتھی فوجی کے کہنے پر اس کے ساتھ چل دیتا۔ فوجی اب ایک دوسرے سے بھی تنگ پڑنے لگے تھے۔ جیل انہیں تنگ دل بنا رہی تھی۔

جیل میں حجام آتا انکے بال کاٹتا، شیو بناتا لیکن کپڑے بوسیدہ ہو چکے تھے۔ نئے کپڑے درکار تھے۔ ہندوستانی حکومت کا بجٹ نہیں تھا۔ کبیر کے ساتھ فلائنگ آفیسر عباس تھا- جو اپنی منگیتر کو یاد کرتا رہتا تھا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ وقار تھا- جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔۔ اسکوڑن لیڈر فضل احمد تھا- جس کا ایک بیٹا تھا- جس کی باتیں وہ کرتا رہتا تھا- دو سالہ بیٹے کی شرارتیں اسے یاد آتی۔ ونگ کمانڈر فرحت عالم تھا جس کی ماں بیمار تھی۔ اس کی بیوہ ماں نے اسے محنت مشقت کر کے پالا تھا۔ گروپ کیپٹن بلال احمد تھا- جس کے نو عمر بچے تھے۔ ائیر کموڈور خاور بنگش تھا جو اپنے پٹھانی لہجے میں گانے گاتا۔ اس کے باوجود فلائنگ آفیسر کبیر خان بر کی بہت غم گین تھا۔

دن بدن قیدی فوجیوں کا مورال ڈاؤن ہو رہا تھا۔

یہ قید انکے بدن سے روح کھینچ رہی تھی۔ حسنہ بیگم کبیر خان کی تنخواہ سے ایک روپے بھی خرچ نہ کرتی کہ یہ میرے قیدی بیٹے کی کمائی ہے۔ وہ ان روپے کو جمع کرتی رہتی۔ وہ اس تنخواہ کو ہر ماہ گاؤں کے سنار امام بخش کے پاس جمع کرواتی۔ امام بخش اس رقم سے کبیر خان کی بری کا زیور تیار کرتا۔

"جب کبیر خان لوٹے گا تو اس کی شادی کرونگی"۔

حسنہ ہمسائیوں سے کہتی۔

کبیر خان کو ماموں کی بیٹی پسند تھی۔ جب بہت ٹوٹ جاتا تو خالدہ اسے یاد آتی۔ اس نے خالدہ سے وعدے وعید نہیں کیے تھے۔ بس یک طرفہ محبت تھی جو اس کے سینے میں مقید تھی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ جب میری شادی خالدہ سے ہو گی اور بچے ہونگے تو میں اپنے کسی بچے کو فوج میں نہیں بھجوں گا

۔ میرا بچہ ایسی تکلیفیں نہیں سہے گا۔ پھر اسے باپ کا خیال آیا- ہائے میرے باپ کے دل کی حالت کیا ہو گی۔ میرے بچے کا ابھی وجود نہیں ہے تو مجھے اس پر قید کی سختی اور تنگی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ ہائے میرا باپ کیسے سہتا ہو گا میری یہ قید۔

اور مجھ سے جدائی۔ کبیر کے آنسو گرنے لگے

وہ روتا رہا-

دل کا غبار نکلتا رہا۔

کچھ دن بعد پاکستان نے ہندوستان کو میچ میں ہرا دیا- کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی سب نے گانے گائے ڈانس کیا پارٹی منائی۔ بھارتی سپاہی انہیں گھورتے رہے۔

قیدیوں کے حوالے سے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ایک خفیہ منصوبے پر اتفاق ہوا جس کے تحت بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد بھارت نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لئے ۱۹۷۲ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک قرارداد پیش کی۔ بھارت کی جانب سے پیش کی گئی اس قرارداد کو سلامتی کونسل کے بیشتر ارکان کی حمایت حاصل تھی اور قوی امکان تھا کہ یہ قرارداد منظور ہو جاتی اور بنگلہ دیش اقوام متحدہ کا رکن بننے کے بعد آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرتا- جس کے بعد بھارت ان ۹۰ ہزار قیدیوں کو بنگلہ دیش کے حوالے کر دیتا اور پھر بنگلہ دیش ان قیدیوں پر اغواء، قتل، زنا اور جنگی جرائم کے مقدمات چلا کر انہیں سرعام پھانسی پر لٹکاتا- جس کا مقصد قیدیوں میں شامل سینئر فوجی افسران و اہلکاروں کی تذلیل کرنا تھا لیکن ایسی مشکل صورتحال میں سلامتی کونسل کے رکن ملک چین نے پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا اور بھارتی قرارداد کو ویٹو کر کے بھارت کی گھناؤنی سازش کو ناکام بنا دیا- جس کے بعد یہ قیدی بھارت کیلئے بوجھ بن گئے اور اس طرح شرائط کے بغیر ان فوجیوں اور سویلین کی واپسی ممکن ہوئی۔

جولائی ۱۹۷۲ میں شملہ معاہدہ ہوا۔

مشرقی پاکستان چھن چکا تھا- نوے ہزار سے زائد جنگی قیدی تھے اور مغربی پاکستان کا آٹھ نو ہزار مربع کلومیٹر کا علاقہ بھی دشمن کے قبضہ میں تھا۔

پاکستان سیاسی طور پر دنیا بھر میں تنہا تھا- جبکہ بھارت کو کھلی جارحیت کے باوجود بنگالیوں کا نجات دہندہ سمجھا جارہا تھا۔

پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اندرا گاندھی سے جنگی قیدی واپس لیے۔ رقبہ واپس لیا اور فوجیوں پر مقدمات نہ چلانے کی شرط بھی منوالی

oooooooooooo

عظیم خان بیمار تھا اس کی عمر ایک سو تین برس ہو چکی تھی۔ اس پر نمونیا کا شدید حملہ ہوا۔

دو ماہ بیمار رہ کر عظیم خان چل بسا۔ اس کی آنکھیں پوتے کی منتظر رہی مگر قسمت میں دیدار نہیں تھا۔

محمد بی بی کا برا حال تھا۔ بیماری، بڑھاپا اور پوتے کی قید نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

عظیم خان کو دنیا سے گئے آٹھ ماہ ہوئے تو ایک دن محمد بی بی بھی خاموشی سے چل بسی۔ رفیق اور حسنہ اکیلے رہ گئے۔

رفیق اکیلا چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ حسنہ پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ اسے چوبیس سال پہلے کی دوپہر یاد آئی- جب وہ اپنے خاندان کے ہمراہ لُٹا پُٹا ہوا ہندوستان سے پاکستان اس گھر میں پہلی دفعہ پہنچا تھا۔ اسی صحن کے بیچوں بیچ وہ سب افراد کھڑے تھے۔ خالی ہاتھ، خالی دل- آج بھی وہ اکیلا اس صحن میں بیٹھا ہوا تھا خالی ہاتھ، خالی دل

سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ بزرگ قبروں میں جا سوئے۔ جوانوں کی شادیاں ہو گئی۔ بیٹیاں اپنے گھروں کو چلی گئی۔

دھیاں جوائی لے گئے بہویں لے گئیں پوت
تریا جوبن لے گئی رہ گئے اوت کے اوت

ooooooooooooo

پندھرواں باب

رہائی

کبیر خان بھی ڈبہ والا گاؤں واپس لوٹ آیا۔ وہ بے حد کمزور ہو چکا تھا۔ ذہنی طور پر بھی تھک چکا تھا۔
دادا، دادی کی وفات کی خبر نے اسے مزید غم زدہ کر دیا۔
اس کی ماں حسنہ نے اس کی شادی کی ساری تیاری کر رکھی تھی۔ دھوم دھام سے اس کی شادی خالدہ سے کر دی گئی۔ خالدہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی-
خالدہ خوبصورت اور خوب سیرت تھی-وہ صابر وشاکر عورت تھی-اس نے کبیر کے زخموں پر مرہم رکھا-کبیر کی روح و قلب کو مسیحائی بخشی-وہ کبیر پر اپنے وجود کی تمام چاشنی انڈیل کر خود سپردگی کی ایسی لذت دیتی کہ کبیر خود کو جنت میں محسوس کرتا-کبیر کی ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار تھی-چار سال کے عرصے میں وہ دو بیٹوں کا باپ بن گیا-ایئر فورس کی دی ہوئی بے شمار سہولیات جس میں وسیع و عریض بنگلہ، ملازمین کی فوج، گاڑیاں، ڈرائیور شامل تھے-خالدہ اور کبیر کی گزشتہ دیہی طرز معاشرت کے مقابلے میں بلند تر معیار زندگی تھے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک، بہترین اسکول، اچھے اسپتال غرض یہ کہ ہر سہولت میسر تھی-خالدہ اپنے رب کا شکر کرتے نہ تھکتی-وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے جلد ہی بیگمات میں نمایاں ہو گئی-وہ لیڈیز کلب کی سیکریٹری بن گئی-اس نے گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے گریجویشن کر رکھی تھی-تعلیم اس کے بے حد کام آئی۔ وہ پفوا میں بھی فعال کردار ادا کرنے لگی-حسنہ کی بھابھی نے اسے سلائی کڑھائی میں ماہر کر رکھا تھا-وہ ائیر مین کی بیویوں کو سلائی سکھانے لگی۔ کوکنگ کے لیے اس کے پاس بیٹ مین، اوپری کاموں کے لیے لاسکر، لان کے لیے مالی، صفائی کے لیے ماسی اور کپڑوں کے لیے دھوبی تھے-خالدہ کا والد یعنی کبیر کا ماموں انیتس چک میں زمینداری کرتا تھا۔ خوشحال خاندان تھا۔ کبیر خالدہ کی تعریفیں اپنے کولیگ کی زبانی سنتا تو بہت خوش ہوتا-دونوں میاں بیوی خوش شکل اور خوش گفتار تھے۔ ان سب کے باوجود کبیر ہندوستانی قید کے بارے گفتگو سے پرہیز کرتا-وہ

یکدم خاموش ہو جاتا- چہرے پر حزن وملال کے بادل چھا جاتے- اس کی اس حالت کی وجہ سے لوگوں نے اس کے سامنے اکتہر کی جنگ کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔

کبیر کی چھوٹی بہن فاطمہ کا رشتہ رفیق نے گاؤں میں اپنی برادری میں طے کر دیا۔

کبیر کے ستارے عروج پر تھے۔ کبیر خان کی پوسٹنگ رفیقی بیس شور کوٹ میں تھی کہ ڈیپوٹیشن کے لیے اس کا نام آ گیا۔ رفیق خان کے آنگن میں دولت کی جھنکار سنائی دینے لگی- کبیر خان کو ڈیپوٹیشن پر ابو ظہبی بھیج دیا گیا۔

خالدہ دو سال کے لیے بچوں کے ہمراہ سسرال رہنے آ گئی۔

فاطمہ کا جہیز بننے لگا۔

حسنہ اور خالدہ کی آپس میں اچھی بنتی تھی۔ بچے بھی دادا دادی کے ساتھ بہت خوش تھے۔ سال بعد کبیر خان سامان سے لدا پھندا ہوا ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آیا۔ حسنہ نے سارے گاؤں کو تحائف بانٹے۔ ائیر فورس کے جہاز بھر بھر کے ائیر فورس والوں کے لیے سامان لاتے تھے۔ فاطمہ کے جہیز کے لیے کے- ٹی کے تھان، گھڑیاں، استری ،جوسر ،بلنڈر، فریج کبیر لے آیا- ایسی دھوم دھام سے شادی ہوئی کہ گاؤں والے ہکا بکا رہ گئے- سب فاطمہ کے شوہر ارشد خان ترین کی قسمت پر ناز کرنے لگے - الیکٹرونکس کا سامان اسی کی دہائی میں پاکستان میں نایاب تھا۔ کبیر خان کی بدولت پہلا ٹی وی سیٹ حسنہ اور رفیق خان کے گھر آیا تو سارا گاؤں شام مغرب کے بعد ٹی وی دیکھنے رفیق خان کے گھر جمع ہونے لگا۔ صحن میں سر شام چھڑکاؤ کیا جاتا اور ٹی وی صحن میں رکھ دیا جاتا۔

گاؤں میں بجلی نہیں تھی- جنریٹر پر ٹی وی چلایا جاتا۔

حسنہ کا صحن گاؤں کے افراد خاص طور پر بچوں سے بھر جاتا- وہ بہت خوش ہوتی۔ کبیر نے پانچ ایکڑ کا مالٹوں کا باغ خرید کر رفیق خان کو دے دیا۔

گاؤں کا مکان جو اب تک کچا تھا- اسے پکا کرنے کے لیے اس نے رفیق خان کو ایک لاکھ دیا۔ ایک سال بعد جب کبیر خان واپس آیا تو رفیق خان کا کچا مکان پکا ہو چکا تھا۔ محمودہ یہ دیکھ کر حسد کا شکار ہو گئی۔ اس نے بھی اپنے بڑے بیٹے کو باہر بھیجنے کی ٹھانی۔ سعودی عرب کا ویزہ لیا۔ اس کا بیٹا سعودی عرب چلا گیا۔ شومئ قسمت اسکا کفیل بگڑ گیا اور اسے جیل ہو گئی۔ اس کام کے لیے محمودہ نے اپنا زیور بیچا تھا۔

زیور بھی گیا اور بیٹے کو بھی جیل ہو گئی۔

محمودہ کارورو کر برا حال تھا۔ دو سال کی سزا کاٹ کر محمودہ کا بیٹا گھر لوٹا اور پھر سے جمیل کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے لگا۔

کبیر خان کو اسکوارڈن لیڈر کا رینک لگ گیا۔

گاؤں میں سڑک بننے لگی - سڑک نے گاؤں کو شور کوٹ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ملا دیا۔ سڑک بنی تو بجلی بھی آ گئی۔ اب ڈبہ والا اسٹیشن ویران ہونے لگا۔ بسوں کے ذریعے سفر ہونے لگا۔ لمبے سفر پر جانے والے ٹرین پکڑتے باقی لوکل تو بس سے سفر کیا جاتا۔

کبیر خان اور اس کے بچے ٹرین سے ہی آتے۔

کبیر خان کی پوسٹنگ پشاور ہو گئی۔

بیوی بچے بھی ساتھ چلے گئے۔ حسنہ کا گھر خالی ہو گیا۔ کبیر کے خط کا انتظار کرتی رہتی۔ اسوقت پاکستان اور افغانستان کی نام نہاد جنگ جو جہاد کے نام پر لڑی جا رہی تھی - وہ جنرل ضیا کی قیادت میں اپنے عروج پر تھی - خالدہ جنگ سے خوف زدہ تھی - جن فوجی افسروں کو لڑنے افغانستان بھیجا جاتا تھا - انکی فیملیز کو پشاور میں رکھا جاتا تھا - وہ فیملیز اپنے شوہر / بیٹے / باپ کی پرموشن کے خواب دیکھتے ہوئے جدائی سہتے - ان مجاہدین کو ترقی بھی ملتی، روپے پیسہ بھی۔۔۔

لیکن خالدہ بہت ڈری ہوئی تھی - خالدہ کبیر کی پوسٹنگ کے لیے دعا کرتی رہتی - دو سال بعد پشاور سے کبیر کی پوسٹنگ کراچی کر دی گئی - جس پر خالدہ نے کلمہ شکر ادا کیا - کراچی کا موسم معتدل تھا - ساحلی ہوا چلتی رہتی - جس سے گرمی کا موسم خوشگوار رہتا - سردی بھی معمولی نوعیت کی تھی - بیس ساحل سمندر کے کنارے پر تھا - کشادہ بنگلے بنے ہوئے تھے - بچے اور خالدہ بہت خوش تھے - کبیر نے اسکواش کھیلنا شروع کر دی - بچے پارک میں جاتے سائیکل چلاتے اور مزے کرتے - کبیر حسنہ اور رفیق کو اپنے پاس بلا لیتا وہ بھی بہت خوش ہوتے بیس کی صفائی ستھرائی انہیں بے حد پسند تھی مگر گاؤں میں کئی بکھیڑے تھے جو انہیں واپسی کا رستہ یاد دلاتے رہتے -

انہی دنوں کراچی کے حالات خراب ہونے لگے - کبیر کا خاندان بیس میں محفوظ تھا -

پھر اسے گوادر بھیج دیا گیا۔ اب اسے ونگ کمانڈر کا رینک لگ گیا تھا۔ نوے کی دہائی میں سی پورٹ گوادر کا کام شروع ہو چکا تھا۔

اس کے رات دن گوادر کے ساحل پر گزرنے لگے۔ گوادر کا موسم کراچی جیسا تھا- خوشگوار ساحلی ہوا چلتی رہتی۔ بدن کو چھوتی تو لطف دیتی۔ کبیر خان واپسی پر ایرانی قالین، پستے اور پلاسٹک کے ایرانی ڈنر سیٹ لاتا۔

بچے اس کے کیڈٹ کالج میں چلے گئے۔ باپ کی طرح وہ بھی فوجی بننے کے متمنی تھے۔

ایک دفعہ پھر کبیر خان کو ڈیپوٹیشن مل گئی- گروپ کیپٹن کی حیثیت سے اسے قطر بھیجا گیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ قطر چلا گیا اور اصرار کر کے رفیق اور حسنہ کو بھی بلا لیا۔ ان دونوں کا دل گاؤں سے باہر نہیں لگتا تھا۔ بمشکل ایک ماہ گزار کے دونوں واپس آ گئے۔

دو سال قطر گزار کر کبیر کی پوسٹنگ اسلام آباد بیس پر ہو گئی۔

اسکے بڑے بیٹے طلحہ کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور وہ ملٹری اکیڈمی کاکول میں فوجی ٹریننگ کے لیے چلا گیا-

کبیر کو بیٹے کے فوج میں افسر بننے کی بے حد خوشی تھی-

وہ ائیر کموڈور کے عہدے پر فائز تھا کہ کارگل کی جنگ شروع ہو گئی۔

اس کا بڑا بیٹا طلحہ خان کاکول اکیڈمی سے نیا نیا پاس آوٹ ہوا تھا- وہ سیکنڈ لیفٹینٹ کے عہدے پر فائز تھا کہ اس کی پوسٹنگ کارگل کر دی گئی۔

بھارت پاکستان جنگ زوروں پر تھی۔ شہادت کی خبریں آ رہی تھی۔

کبیر اور خالدہ بیٹے کے لیے بے حد فکر مند تھے۔ دن رات دعائیں کر رہے تھے کہ انکے بیٹے کی شہادت کی خبر آ گئی۔

کبیر، اس کی بیوی خالدہ، بوڑھے رفیق خان اور حسنہ کا برا حال تھا۔ ماتم کرتے کرتے انکے وجود شل ہو گئے تھے۔ رفیق خان کے جانے کے دن تھے۔ مگر جوان پوتا چل بسا۔ تقدیر کے آگے کس کا زور چلا ہے۔ تقدیر کا وار سہنا پڑتا ہے۔ کبیر خود بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ بیٹے کی معصوم مسکراہٹ، اس کی باتیں
اس کے ذہن میں گھوم رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو
جاری تھے

بیٹے کا جنازہ اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار کر کبیر کو ابھی صبر بھی نہیں آیا تھا کہ جنگ بندی کے فیصلے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

خالدہ نے جس بیٹے کے سر پر سہر اسجانے کا خواب دیکھا

تھا اس کا چہرہ لہو سے نہا

گیا۔ میرے بیٹے کے خون کا سودا کیا گیا ہے۔

کس سے فریاد کروں؟

کہاں جاؤں

وہ خود سے سوال کرتا

اسے ہندوستانی جیل کی وہ رات یاد آگئی جب اس نے خود سے عہد لیا تھا کہ اپنے بیٹے کو فوج میں نہیں بھیجے گا۔

لیکن انسان کا مقدر انسانی عہد سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

دوسرے بیٹے کا کیڈٹ کالج حسن ابدال میں آخری سال تھا۔ کبیر نے ایف ایس سی کے بعد اسے گھر بلا لیا۔ اور مقامی انجنیئرنگ یونی ورسٹی میں داخل کروادیا۔

دوسرا بیٹا کھونے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

اسکا چھوٹا بھائی جمیل، محمودہ اور انکے بچے گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ جمیل آبائی زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اس کے بچے زیادہ پڑھ لکھ نہ سکے۔ وہ بھی باپ کے ساتھ زراعت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ وہ سب رفیق اور حسنہ کا خیال رکھتے تھے۔ بار بار کبیر کے اصرار کے باوجود رفیق اور حسنہ گاؤں نہ چھوڑتے۔ چند دن کے لیے آکر رہتے اور واپس چلے جاتے۔ کبیر انہیں اپنے پاس بیس پر رکھنا چاہتا تھا۔

وہ والدین کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ زندگی نے جو سہولتیں اسے دی تھی انہیں وہ والدین سے بانٹنا چاہتا تھا۔

کبیر کا والد رفیق خان دل کا مریض ہوگیا تھا۔ کبیر نے والد کا بائے پاس کروایا۔ بائے پاس کے بعد رفیق کی صحت خراب رہنے لگی

ایک دن دل کا دورہ پڑا اور رفیق خان کا انتقال ہوگیا۔

والد کے انتقال کے بعد وہ اپنی والدہ حسنہ کو اپنے پاس لے آیا۔

کبیر کی پروموشن ہوگئی اور اسے ایئر وائس مارشل کا رینک لگ گیا۔ لیکن اب اس کا دل بجھ چکا تھا۔ چھوٹے بیٹے کی اس نے شادی کر دی اور خود کو پوتے میں مشغول کر لیا۔

زندگی کی مٹھاس اس کے لیے کڑواہٹ میں بدل چکی تھی۔ زندگی کا چہرہ اس قدر بد صورت ہو گیا تھا کہ وہ ایک نظر ڈالتا تو دوسری ڈالنے کو اس کا دل نہ چاہتا۔ وہ جی نہیں رہا تھا-بس زندگی کے دن پورے کر رہا تھا-

حسنہ اسے مغموم دیکھتی تو اس کا دل بہلانے کے لیے پرانی باتیں چھیڑ دیتی۔ کبیر کے بچپن کے قصے کہانیاں۔ چند لمحات کے لیے کبیر کے چہرے پر مسکراہٹ آتی اور پھر اداسی چھا جاتی۔ کبیر کی ریٹائرمنٹ کے بعد حسنہ، کبیر اور خالدہ کے ساتھ حج پر گئی اور وہی وفات پا گئی-اسے شہدائے حرم کے قبرستان مکہ میں دفن کر دیا گیا۔

ماں کو مکے کی مٹی کے سپرد کر کے کبیر واپس وطن لوٹا تو بہت دل گرفتہ تھا-زندگی نے اسے کئی رنگ دکھائے اس کی زندگی کبھی سیدھی لکیر پر نہ چل سکی

oooooooooo

برطانیہ میں رشید خان کے بیٹے گوہر خان کی محنت رنگ لے آئی اور وہ وزیر خارجہ بن گیا۔ رشید خان پھولے نہ سماتا۔

ایک پاکستانی نژاد برطانوی شہری کا یہ پہلا عہدہ تھا۔ رشید خان نے گوہر کی شادی امیر کبیر مسلمان خاندان میں کی۔ جس ملک پر برطانیہ نے حکومت کی تھی- آج اسی ملک سے تعلق رکھنے والے رشید خان کا بیٹا حاکموں کے برابر بیٹھا ہوا تھا

ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی

دنیا میں بہت کچھ بدل رہا تھا۔ بدل چکا تھا لیکن ملک پاکستان میں وہی پرانی کہانی چل رہی تھی۔ ائیر وائس مارشل کبیر خان کے خاندان کے افراد پاکستان میں خدمات سر انجام دینے کے بعد بھی خالی ہاتھ تھے۔ بالکل خالی ہاتھ۔

oooooooo

ختم شد

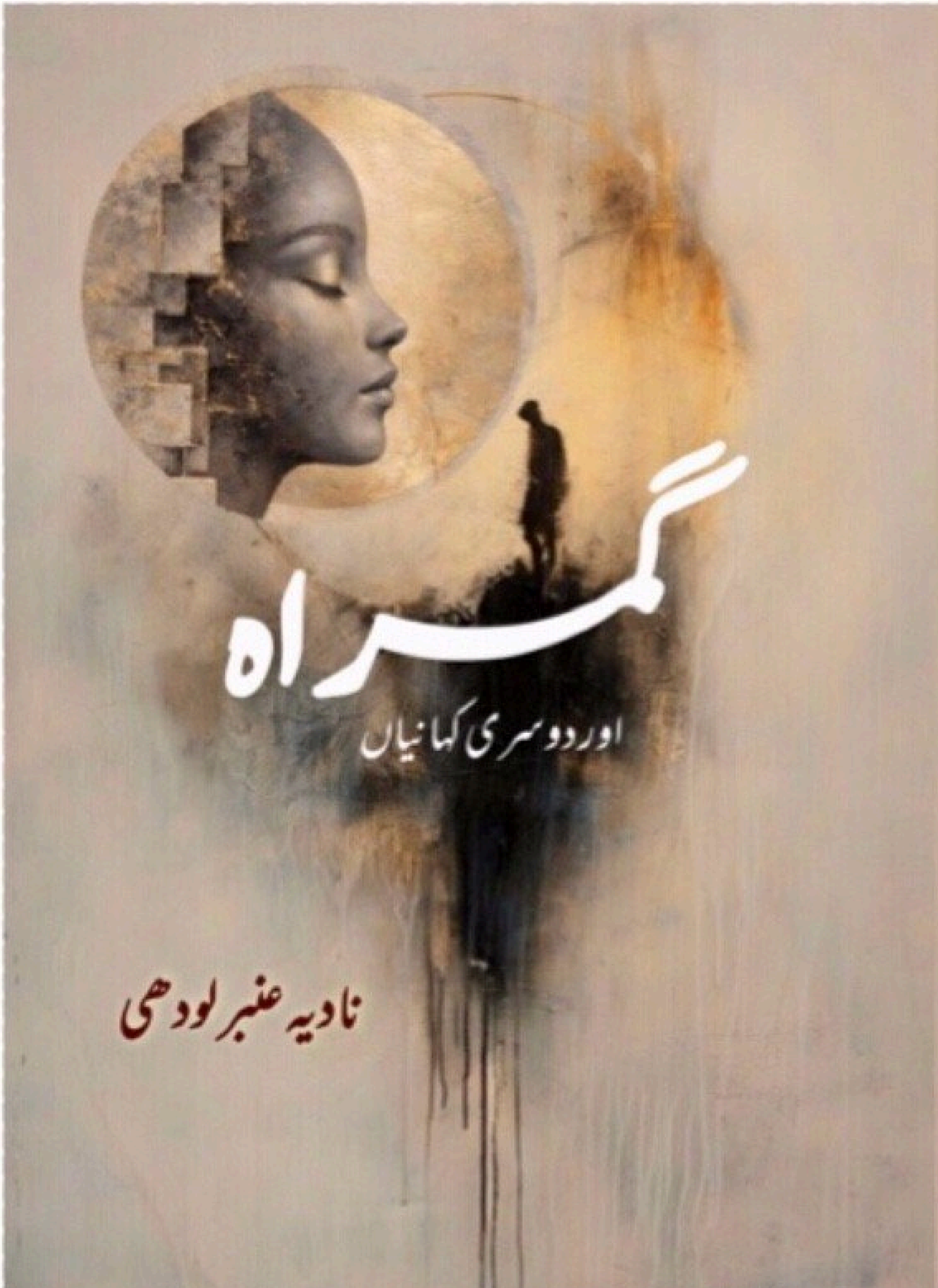
HISTORY OF
LODI SULTANS
OF DELHI AND AGRA

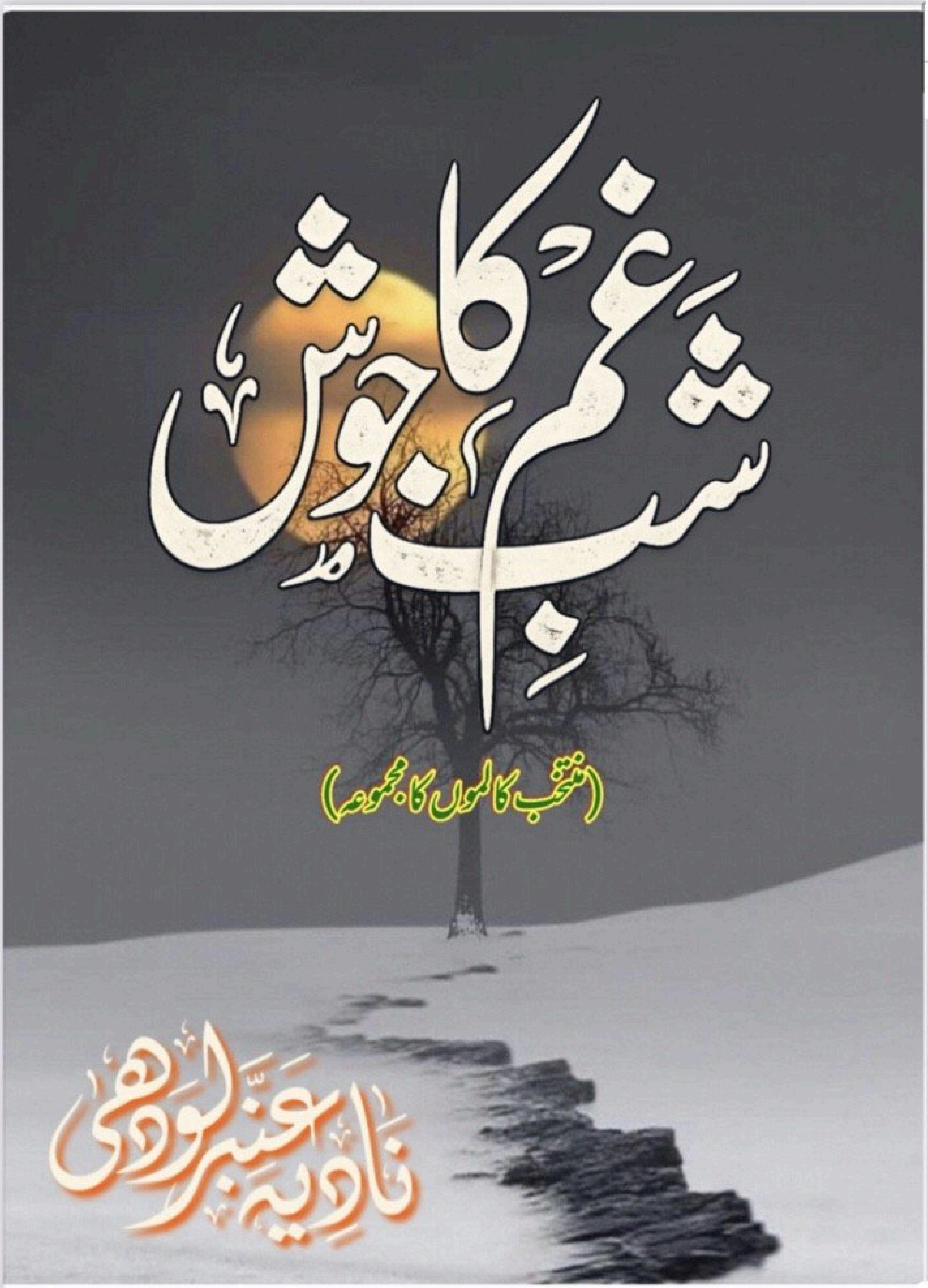
دہلی اور آگرہ کے
لودھی سلاطین کی تاریخ

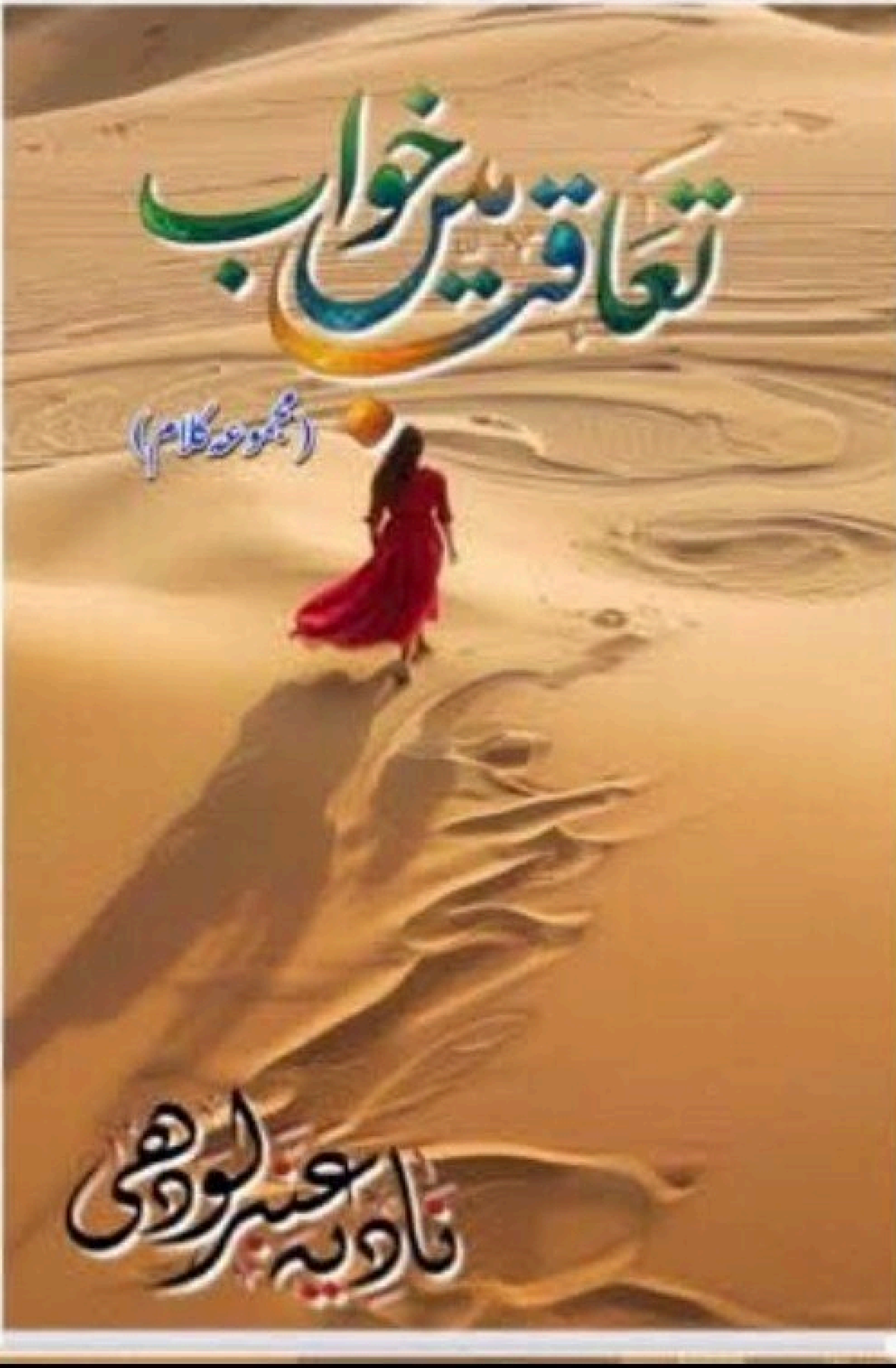


A HALIM

مترجم
نادیہ عنبر لودھی


گمراہ
اور دوسری کہانیاں
نادیہ عنبر لودھی


شبِ غم کا جوش
(منتخب کالموں کا مجموعہ)
نادیہ عنبر لودھی


تعاقب میں خواب
(مجموعہ کلام)
نادیہ عنبر لودھی

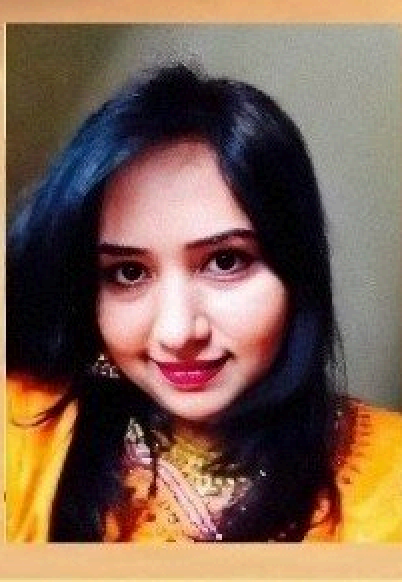

معاصر اُردو شاعرات
حِصّہ اوّل
نادیہ عنبر لودھی

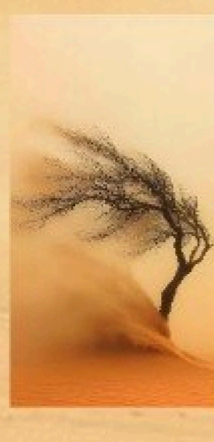

معاصر اُردو شاعرات
حصہ دوم
نادیہ عنبر لودھی


اردو کی خواتین ناول نگار
نادیہ عنبر لودھی

یہ ناول ساندل بار اور جالندھر کے مابین تعلق، پاکستان کی تاریخ تاریخ، ہجرت کے سماجی و ادبی اثرات، جالندھر سے نقل مکانی کرنے والے افراد کی یادیں، ثقافتی ورثے کو ساندل بار (اور پاکستان کے دیگر حصوں) میں منتقل کرنے کی روداد ہے۔ ہجرت کے بعد جالندھر اور ارد گرد کے علاقوں کی بولیاں اور ساندل بار کی مقامی پنجابی کا امتزاج سامنے آیا۔ ساندل بار کے باسیوں کی یہ داستان نئے نئے موڑ لیتی ہے۔ ناول کا پھیلاؤ انگلستان میں بسے ہوئے خاندانوں سے ہوتا ہوا تاریخی ثقافتی، عسکری اور سماجی پہلوؤں پر محیط ہے

This novel is an account of the relationship between Sandal Bar and Jalandhar, the history of Pakistan, the social and literary effects of migration, the memories of those who migrated from Jalandhar, and the transfer of cultural heritage to Sandal Bar (and other parts of Pakistan). After migration, a blend of the dialects of Jalandhar and surrounding areas and the local Punjabi of Sandal Bar emerged. This story of the residents of San Bar takes many twists and turns. The novel's scope extends from families settled in England to historical, cultural, military, and social aspects.





@ankbootpublishers
ankbootali@gmail.com